Title - AL KULLIYAAT ; KULLIYAAT-E-DEEN.

Creator - Maulana Azad Subhani.

Publisher - Maktaba Rabbaniya, Dayra Rabbaniya (Gorakhpur)

Date - 1861

Pages - 168.

Subjects -

سلسلۂ تصنیفات ربانی کے شعبۂ دینیہ کی

پہلی کتاب

الکلیات

کلیات دین

(مصنفہ)

شیخ الربانیہ فیلسوف ربانی مولانا آزاد سبحانی

اشاعت شدہ

مکتبہ ربانیہ۔ دائرہ ربانیہ۔ گورکھپور (یو۔پی)

قیمت [illegible]

طبع اوّل ——— ایک ہزار

قیمت ———

حسن سبحانی ربانی مدیر رسالہ دعوت کے زیر اہتمام عزیزیہ پریس کلکتہ سے شائع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ اوّل افتتاحیہ

دورِ حاضرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے بے دینی کو نشانِ عہد بنادیا ہے۔ بے دینی پہلے شاذ و نادر قسم کی بیماری تھی اب وبائی بیماری بن گئی ہے، جسکو دیکھئے اصل حقیقت کے اعتبار سے بے دینی کا بیمار ہے۔ ع کوئی دل چیر کر دیکھے عقیدہ ہر مسلمان کا۔
بے دینی دورِ حاضرہ سے کیوں اس بری طرح لپٹ گئی ہے اس لئے کہ فلسفہ نفسانی جو دین کا مستقل حریف ہے بے حساب ترقی کر گیا ہے اور دین کی حکمت ربانی حالت جمود میں وہیں ہے جہاں صدیوں پہلے تھی — دین کی وکالت دورِ حاضرہ میں کی ان لوگوں نے جو کہ فلسفہ نفسانی سے اس کی گہرائی اور ارتقائی شان کے ساتھ واقف نہ تھے نہ دین کی حکمت ربانی کو اس تعمق سے جانتے تھے کہ اسکے وسعتی لفظوں کو سمجھ سکتے نہ وہ فطری فیلسوف تھے جو تفسیرِ دین میں اجتہاد کی ہمت کر سکتے یا اجتہاد کو کامیاب اجتہاد بنا سکتے اور اس طرح دین کی حکمت ربانی کو ارتقائی شان بخش سکتے —— حکمی مفسرین دین کی بھی پوری جماعت وقف تقلید تھی، ہمالستان (ہندوستان) میں حکیمانہ تفسیرِ دین کا مرکز و مرجع آخری شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ بنائی گئی تھی، مصر میں جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ کی کتابیں ملجا و ماوی قرار دیدی گئی تھیں جدیدئین ہند، شبلی، اور اقبال کی تفسیرِ دین کو بھی وکیل انتہائی کا درجہ دے رہے تھے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ یہ سارے سامان ناکافی تھے یہ پورا ذخیرہ حکمت دین کے تصور اساسی ہی میں ناقص تھا تو اور آگے کیا چلتا۔

بڑھتی ہوئی بے دینی کا مقابلہ کامل ضروری تھا، اور پہلے علمی مقابلہ کامل ناگزیر تھا، اس ضرورت نے الکلیات کو پیدا کیا، اور ساتھ ہی ساتھ ایک سلسلہ تصنیفات کی ضرورت کو بھی پیدا کر دیا جو الکلیات کے علاوہ چھ دوسری کتابوں پر حاوی ہوگا، وہ یہ ہونگی، الدین، العقائد، الاحکام، الحقائق، الایمانیات

الدلائل، الکلیات آپ کے ہاتھوں میں ہے، بقیہ چھ کتابیں بھی اپنی اپنی نوبت میں انشاءاللہ سامنے آجائیں گی ——— الکلیات کیا وہ خصوصیت رکھتی ہے جن کی بنا پر اس کو تفسیر دین کی تمام کتابوں پر جس پر اب تک تفسیر دین میں بھروسہ کیا گیا ہے امتیاز حاصل ہے قدرے افسوس ہے کہ ان خصوصیتوں کی تشریح خود مصنف کو اپنے قلم سے کرنا پڑتی ہے جو خود مدحی کا الزام لگا سکتی ہے لیکن کیا کیجئے کہ بسا اوقات یہ معیوب فرض بھی ادا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس لئے ہو جاتا ہے کہ ایک جوہر نادر کی ندرت و قیمت اگر یہ فرض ادا نہ کیا جائے خطرے میں پڑ جاتی ہے امید ہے کہ حکمار اخلاق اس معذرت کو شرف قبول بخش کر اصل معاملے کو مورد توجہ بنائیںگے۔ نقشہ خصوصیات حسب ذیل ہے۔

---

(۱) الکلیات (کلیات دین) کا موضوع دین ہے، مگر جزیاتی پہلو سے نہیں کلیاتی پہلو سے ——— الکلیات کی غرض دین سے بحث کرنا اور دین کو اچھالنا ہے اس حیثیت سے کہ اسکی کلیاتی صورت حکمت و فلسفہ کی روشنی میں مگر ربانی حکمت و فلسفے کی روشنی میں کیا ہے اور اس صورت میں اس کی حقیقی منزلت و عظمت کیا ہے ——— پھر یہ بتانا ہے کہ دین کن کن کلیاتی حقیقتوں اور کن کن کلیاتی مسئلوں کا مجموعہ ہے اور ان کی باہمی روابط کیا ہیں پھر ان کلیاتی حقیقتوں اور مسئلوں کی فلسفیانہ تشریحیں کیا ہیں تاکہ دین کی حقیقت عقلی روشن ہو جائے اور اس کی حقائق کلیہ بھی عقلی حیثیت سے نمایاں ہو رہیں ——— دین اس عظیم و عجیب نقشے کے ذریعے اپنے عظیم و عجیب انکار کی وجہ سے اتنا عظیم الشان بن گیا ہے کہ بڑی سے بڑی مغرور حکیمانہ عقلیں اسکے آستانہ عظمت پر سر جھکانے اور پیشانی رگڑنے پر مجبور ہو جائیں گی درحالیکہ اس نقشے سے الگ معمولی ازادہ رو عقلیں بھی اسکو دیکھ کر پیشانی پر بل ڈال لیتی ہیں اور بے محابانہ گستاخی کے لہجے میں کہہ اٹھتی ہیں کہ ان ھو الا اساطیر الاولین و اوھام المتوھمین ——— دین اس نقشہ حکیمانہ سے الگ صرف دعویٰ الہام یا مجموعہ اوہام معلوم ہوتا ہے لیکن اس نقشے سے سراپا حکمت و فلسفہ دکھائی دینے لگتا ہے ——— یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ الکلیات کا یہ کارنامہ تخلیقی نہیں ہے تفسیری ہے، الکلیات اس فلسفے کی مخترع نہیں ہے صرف مفسر و موضح ہے۔ اس

ماخذوں کی روشنی میں غور کیا جائے تو روشن ہو جائے گا کہ جدت کے ساتھ ساتھ ان میں صحت بھی موجود ہے —— ہر نئی بات پر وحشت قدرتی بات ہے مگر وحشت کو جہالت تک پہونچا دینا مصنوعی حرکت ہے اور غلط حرکت ہے —— ہر نئی چیز غلط نہیں ہوتی جیسا کہ ہر پرانی چیز صحیح نہیں ہوتی اور جس طرح ہر پرانی چیز غلط بھی نہیں ہوتی —— صحت کا معیار قدیمیت نہیں ہے بلکہ معقولیت ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح صحت کا معیار جدیدیت نہیں ہے بلکہ معقولیت ہے افسوس کہ معیار صحت اور فیصلہ کے باب میں قدیمین اور جدیدیین دونوں نے دھوکہ کھایا ہے یا غلو برتا ہے —— اگر ہر نئی بات کا غلط ہونا ضروری ٹھہرا لیا جائے تو پھر کوئی بات صحیح نہیں ٹھہر سکتی ہر پرانی چیز کسی زمانے میں نئی چیز یقیناً رہی ہوگی، اسی طرح اگر ہر پرانی بات کا غلط ہونا لازمی کر دیا جائے تو کوئی بات صحیح نہیں مانی جا سکے گی، ہر نئی بات آگے چل کر پرانی ہو جاتی ہے ——

پھر وہ نئے مسائل فرعی اور ضمنی ہیں جن میں جدت نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو علم فقہ علم عقائد بلکہ علم تفسیر وجود ہی میں نہیں آسکتے تھے کیونکہ وہ جدتوں سے بھرپور ہیں —— پھر یہ تو سوچو کیا دین نعمتِ ارتقا سے محروم ہے اور کیا یہ نہیں معلوم کہ جہاں جدت نہیں وہاں ارتقا کہاں؟ یہ بھی یاد رکھو کہ اگر دین ارتقا کی قابلیت نہیں رکھتا تو ابدیت اور دوامیت کے قابل نہیں ہو سکتا حالانکہ ابدیت اور دوامیت دین کے لوازمات میں سے ہے —— پھر یہ ساری جدتیں اور ندرتیں صرف استنباطی اور استدلالی مقالات میں ہیں، اصولی مباحث اور منصوصی مسائل میں نہیں ہیں جن میں جدتیں اور ندرتیں یقیناً ممنوع اور معذور ہیں اور کم سے کم مشکوک و مخدوش تو ضرور ہیں۔

(۲) الکلیات، بیشک کوئی صحیفۂ الٰہی نہیں ہے، اس لئے اس کے لئے لاریب فیہ اور لایاتیہ الباطل کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں غلطیوں کا دخل ہو سکتا ہے، اگر غلطیوں کا علم ہوا خواہ خود اپنی ہی تصحیحی نظر سے خواہ دوسروں کی تنقیدی فکر سے تو بلا ادنیٰ تردد و تعصب کے ان غلطیوں کا اعتراف کر لیا جائے گا اور ازالہ کر دیا جائے گا —— الکلیات کا مسلک ربانیت ہے نہ کہ نفسانیت، ربانیت میں غلطیوں کا اعتراف و ازالہ کمال ہے نہ کہ نقص —— البتہ معاندانہ تنقیدوں کی بالکل پروا نہیں کی جائیگی۔ معاندانہ تنقیدیں خود غلط ہوتی ہیں ان کی پروا کرنا غلطیوں کی پروا کرنا ہے، غلطیوں کی پروا کرنا راستیوں کا خون کرنا ہے —— الکلیات کے متعلق بہ حالت موجودہ تو یہی علم ہے کہ اس کا

نوشتہ نوشتہ صحیح اور حق ہے اور اسی علم کے ساتھ وہ دنیا پر پیش کی جارہی ہے اور اس لئے یہ
بجا طور پر چاہا جارہا ہے کہ اسیر حق پرست طبیعتیں بلا تردد و تامل ایمان لائیں البتہ انھیں اسکی اجازت
ہے کہ اسکے متعلق تنقید و تحقیق کو بھی جاری رکھیں مگر ایسی تنقید و تحقیق کی اجازت ہے جسکا
خاصہ بے جا نکتہ چینی اور خواہ مخواہ کی عیب جوئی سے پرہیز کرنا ہے' نفسانی تنقید و تحقیق
کی اجازت نہیں ہے جسکا منشا نکتہ چینی برائے نکتہ چینی اور عیب جوئی برائے عیب جوئی ہے'
— الکلیات جابجا اشکالات بھی رکھ سکتی ہے لیکن وہیں جہاں تسہیلات ممکن نہیں ہیں
— جو مضامین و مطالب دقیق ہیں ان کے بیانات کتنے ہی سہل رکھے جائیں اشکالات
سے چھٹکارا نہیں مل سکتا ایسے اشکالات معذرت کے قابل ہیں ایسے اشکالات کو مجبوراً
گوارا کرنا پڑیگا اور ان کی طرف سے شکایتیں غلط ہوں گی — پھر یہ معلوم رہنا چاہئے کہ الکلیات
اپنی موجودہ شان میں متوسطین کے لئے ہے مبتدیئین کے لئے نہیں ہے، پس وہ مبتدیوں
کے لئے خواہ مخواہ مشکل ثابت ہوگی، مگر یہ مشکلیت عیب نہیں بن سکتی جبکہ متوسطین کے لئے
جن کے لئے وہ ہے مشکل نہیں ہے —

الکلیات اپنی مذکورہ بالا خوبیوں کی بنا پر قبولیت کا مادہ اور مقبولیت کا حق رکھتی ہے اور اس
قبولیت اور مقبولیت کا حق جو معراجی پیمانے کی ہوتی ہے — اس بنا پر حضرت الوہیت و
ربوبیت سے دعا ہے کہ اسکو قبولیت و مقبولیت اور معراجی قبولیت و مقبولیت کی نعمت عطا
فرمائے اور خلقت سے استدعا ہے کہ اسکا یہ قدرتی حق اسکو حوالہ کرنے میں بخل و دریغ نہ کرے
وفی الاخر افوض امرها الی الله وهو خیر للمفوضین الیهم و توکلت علیه وهو خیر المتوکلین علیهم
— اے ربوبیت کے آفتاب، ربوبیت کی ایک کرن ادھر بھی، اے ربوبیت کے سحاب ربوبیت
کا ایک چھینٹا اس طرف بھی، اے ربوبیت کے مخزن بے حساب الوہیت کا ایک کیسہ الکلیات
کے لئے بھی — اے خیر الموفقین تیری توفیق بخشی اور قلیل النظیر توفیق بخشی کا شکریہ — تو نے
ایک کتاب لکھنے کی توفیق بخشی جسکی نظیر صدیوں سے زمانے کے خزانے میں نہیں ہے —
پھر اس خود ستائی کیلئے جو الکلیات کی حقیقت بیانی کی غرض سے مجبوراً صادر ہوئی ہے —

اے خیر المتکبرین تیری بارگاہ کبریائی میں معذرت — اس بنا پر بھی معذرت کہ وہ فخر و غرور سے خالی ہے اور اس بنا پر بھی کہ یہ تیری ہی ایک سنت کی پیروی ہے — وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دین

دین کی حقیقت

(۱) دین کیا چیز ہے (الف) وہ فطری عالمگیر قانون جو تمام موجودات پر چھایا ہوا، پوری کائنات سے لپٹا ہوا ہے جس کی گرفت سے نہ فرش باہر ہے نہ عرش، نہ ذرہ الگ ہے نہ بڑے سے بڑا سیارہ، نہ روح نہ مادہ نہ بسیط نہ مرکب نہ لطیف نہ کثیف، نہ مکان نہ زمان نہ ازل نہ ابد نہ دنیا نہ آخرت، نہ مخلوق نہ خالق — جو ہر جگہ ہر وقت ہر حال میں ہر رنگ ہر انداز پر کام کر رہا ہے، پوری متانت اور مکمل یکسانیت کے ساتھ بغیر کسی تبدل اور بلا کسی شکست کے، بغیر کسی ضعف اور بلا کسی اضمحلال کے، بغیر کسی دخل اور بلا کسی تصرف کے — مکمل طبیعی فطرتی قدرتی شان سے جس کے لئے نہ کوئی علت ہے نہ کوئی سبب، نہ کوئی غایت ہے، نہ کوئی غرض، جس میں نہ چون و چرا کی گنجائش ہے نہ قیل و قال کا امکان ہے، جو ہے صرف اس لئے کہ ہے جو اس طور پر ہے کہ اسی طور پہ ہو سکتا تھا جس کی بابت یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ کیوں ہے اور یوں کیوں ہے — جو کبھی نہیں بدلا نہیں جاتا جو کبھی کہیں بدلا نہیں جاتا جو کبھی کہیں شکست نہیں کھاتا جس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا جس سے بغاوت ناممکن جس کی اطاعت ناگزیر —

پس بے دینی ناممکن اور بادینی لازمی۔

(ب) یہ عالمگیر قانون کس کا ہے ہر قانون ایک مقنن چاہتا ہے، یہ عالمگیر قانون ایک عالمگیر ہستی کا ہے، اس ہستی کا نام ایک خاص زبان میں اللہ ہے — پس یہ عالمگیر قانون اللہ کا ہے — یوں اللہ بھی ثابت ہے، اور اس لئے اللہ پر بھی ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے جیسا کہ دین پر ایمان لانا ضروری ہے — لیکن دین پر ایمان لانا اللہ کے ایمان لانے پر منحصر نہیں ہے، دین کا ثبوت مشاہدہ ہے، دین دیکھ لینے کی چیز ہے، دین کو ہر شخص دیکھ سکتا

ہے بلکہ دیکھتا ہے، اگرچہ نہ جانے کہ دیکھتا ہے، دین برتنے کی چیز ہے اور ہر شخص دین کو برتتا ہے اگرچہ نہ جانے کہ دیکھتا ہے اور برتتا ہے — پھر بھی دین کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ پر ایمان نہ لایا جائے، کیونکہ اس سوال کا کہ دین جب قانون ہے تو مقنن کون ہے؟ جواب نہیں دیا جا سکتا جب تک اللہ کو نہ مان لیا جائے، پس اللہ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے — اگر دین کو نہ مانا جائے تو کیا کوئی نقصان ہے؟ ہاں نقصان ہے کیا نقصان ہے؟ نقصان یہ ہے کہ معرفت کی جگہ جہالت تم میں اپنا گھونسلہ بنائے گی اور تم بجائے انسان کے گدھے بن جاؤ گے، پھر نقصان یہ ہے کہ تم دین کبھی نہ کبھی زندگی کو ٹکرا دو گے اور زندگی کو پاش پاش کر لو گے جیسے کہ وہ جو آگ کے قانون احراق (جلانا) کو نہیں مانتا اپنے کو کبھی نہ کبھی آگ بھڑکا دیگا اور اپنے کو جلا لیگا۔

(ج) یہ عالمگیر قانون کوئی حکومت بھی تو رکھتا ہوگا، یہ کوئی ذہنی قانون یا کتابی قانون تو ہے نہیں خارجی اور عملی قانون ہے — بیشک اس کے لئے حکومت بھی چاہیئے اور بلا شبہ وہ ایک حکومت رکھتا بھی ہے، یہ حکومت کیا ہے؟ یہ عالمگیر حکومت الٰہی ہے یعنی اللہ کی عالمگیر حکومت جو تمام موجودات پر پھیلی ہوئی ہے۔

(د) یہ عالمگیر قانون کسی علم کے ماتحت ہے اور اس علم کے ساتھ چل رہا ہے یا یونہیں چل رہا ہے پھر کسی عمل کے ماتحت ہے اور اس عمل کے اشارے سے چل رہا ہے یا آپ ہی آپ چل رہا ہے۔ ایک علم اور ایک عمل کے ماتحت چل رہا ہے، کون علم؟ کون عمل؟ عالمگیر علم الٰہی جس کی نگاہ سے ایک باریک سے باریک بال اور ایک ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی مخفی نہیں۔ اور عالمگیر عمل الٰہی جس نے کسی کو بغیر عمل کے نہیں چھوڑا، اور جس کا ہی اشارہ پوری کائنات کو عمل میں لگا تا ر جوتے ہوئے ہے۔

(ہ) یہ عالمگیر قانون کہاں رہتا بستا ہے اور کہاں سے بیٹھ کر پوری دنیا پر اپنا عمل کرتا رہتا ہے — وہ ہر موجود کی حقیقت کے اندر رہتا ہے ہر ہستی کی فطرت میں بستا ہے، ہر چیز کی ہیئت اور صورت پر چھایا رہتا ہے، ذات الٰہی میں بھی صفت بن کر قیام کرتا ہے۔

(و) دین کتنا وسیع ہے اس کا اندازہ کرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ دین انسانوں میں قید نہیں ہے جیسا کہ

دین انسانی بھی کلی اور جزئی دو قسموں میں بٹا ہوا ہے کلی دین انسانی کا نام اسلام ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلعم تک مختلف زمانوں اور جزئی دینوں میں تشکیل پذیر ہوا — ایک جزئی دین انسانی کا نام محمدی اسلام یا محمدیت ہے — محمدیت سلسلہ اسلام یا سلسلہ ادیان جزئی انسان کی آخری کڑی ہے اور جامع و کامل کڑی ہے جسکے بعد کوئی دوسری کڑی نہیں الا کہ محمدیت ہی عہد بہ عہد تازہ ہوتی رہے گی اور ترقی کرتی رہے گی مسلسل تجدید کے ذریعے یہاں تک کہ آخری تجدید آینگی اور تجدید محمدیت کو مکمل کرنیکے ساتھ ہی انسانیت کو مکمل کر کے دین انسانی کو دنیوی سے اخروی یعنی مادی سے روحانی اور ناسوتی سے ملکوتی بنا دے گی اور یہاں نوع انسانی کی حیات ناسوتی کا دور ختم ہو جائے گا اس کے بعد نوع انسانی کی حیات ملکوتی کا دور شروع ہوگا — اسی تغیر دوری کا نام قیامت ہے —

دین انسانی بھی ظاہری اور باطنی دو شاخوں میں منقسم ہے دین انسانی کی باطنی شاخ براہ راست دین کلی کا ایک حصہ ہے اور اس لئے دین کلی کا پورا چربہ ہے اسکی معنوی کیفیت کے لحاظ سے سوا ایک وسعت کے کہ اس میں اس کی وہی حیثیت ہے دین کلی کے مقابلے میں جو ایک قطرے کی حیثیت ہے سمندر کے مقابلے میں — ظاہری شاخ بواسطہ شاخ ہے اور اس لئے اس کو وہ کاملیت میسر نہیں ہے جو دین کلی کا خاص حصہ ہے — دین انسانی کی دونوں شاخوں کو پہچانو اور مانو تب دین انسانی کی پوری معرفت اور مکمل رابطیت نصیب ہوگی ورنہ ناقص معرفت اور ادھوری رابطیت — دین انسانی کی ظاہری اور باطنی شاخوں میں جو فرق ہے اسکا بیان اس طرح بھی ہے کہ دین ظاہری ظلّی دین ہے اور دین باطنی حقیقی دین — حقیقی دین اور ظلی دین کا کلی مخرج تو ایک ہی ہے ذات الٰہی، لیکن جزئی مخارج میں فرق ہے، ظلی دین کا جزئی مخرج کلام الٰہی بہ واسطہ حکم الٰہی ہے، حقیقی دین کا جزئی مخرج فعل الٰہی بواسطہ حکم الٰہی ہے — ظاہری دین انسانی نے واقعاتی اعتبار سے ایک اور تقسیم پیدا کر لی ہے، نفسانی دین اور ربانی دین، ربانی دین وہ دین ہے جو الہام ربانی کے ذریعے منتخب ربانی انسانوں پر اترا اور اپنی اصلیت پر متن اور تفسیر دونوں حیثیتوں سے باقی رہا، نفسانی دین وہ ہے جو یا تو بہ جائے الہام ربانی کے فکر انسانی

مستخرج ہوا اور پھر یا تو اپنی حیثیت پر رکھا گیا یا جھوٹوں الہام ربانی کی طرف منسوب کر دیا گیا، یا نکلا تو الہام ربانی سے ہی مگر اس کو نفس کی خواہش سے محرف کر کے مسخ کر دیا گیا، خواہ متن ہی میں محرف کر دیا گیا یا تفسیر میں محرف کیا گیا ــــ مستند اور معتبر صرف دین ربانی ہے۔ دین نفسانی نہیں ہے۔

جو یہ کہا گیا کہ دین کلی کی مانند باطنی دین انسانی بھی کہیں شکست نہیں کھاتا اور کبھی مغلوب نہیں تو یہ کیوں کر ہے؟ بہ ظاہر تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین انسانی اپنی ظاہری شاخ کے مثل اپنی باطنی شاخ میں بھی گاہ گاہ اور جگہ جگہ شکست خوردہ اور مغلوب ہوتا ہے ــ باطنی دین انسانی بھی ہر انسان کو ہدایت کرتا ہے اور سعادت کی طرف بلاتا ہے جیسا کہ ظاہری دین انسانی لیکن بہتیرے ہیں جو اس کی ہدایت اور دعوت الی السعادت کو رد کر دیتے ہیں ــ واقعہ یوں ہے کہ دین باطنی کی ہدایت اور دعوت عام نہیں ہے خاص ہے، صرف ربانی انسانوں کے لئے ہے نفسانی انسانوں کے لئے نہیں ہے، اسی مقام سے قرآن نے جو دین باطنی اور دین ظاہری دونوں کا حامل ہے ایک جگہ اپنے کو ھدًی للمتقین کہا دوسری جگہ ھدًی للناس فرمایا ــ پس جہاں وہ نہیں مانا گیا وہاں وہ چاہتا ہی نہ تھا کہ مانا جائے بلکہ چاہتا تھا کہ نہ مانا جائے اور جہاں چاہتا تھا کہ مانا جائے وہاں مانا بھی گیا، پس دین باطنی کو کہیں شکست نہیں کبھی مغلوبیت نہیں ــ دین ظاہری اس کے برعکس دعوت کو عام رکھتا ہے اور ہدایت کو محیط کل بنانا چاہتا ہے اس لئے کہیں کہیں یہ شکست اور مغلوبیت اس کے لئے مقدر ہے ــ لیکن دین ظاہری اس معاملے میں دین باطنی کی تقلید کیوں نہیں کرتا، اسلئے کہ دین باطنی کا کاروبار خود حضرت الوہیت کے ہاتھ میں ہے اور وہ کلی علم الغیب رکھتا ہے، دین ظاہری کا کارخانہ انسانیت کے سپرد ہے اور وہ کلی علم غیب سے محروم ہے ــ یہاں ایک دوسری باریک بات بھی ہے دین باطنی کے لئے شکست اور مغلوبیت روا ہی نہیں رکھی گئی اس لئے وہ شکست آشنا اور مغلوبیت شناسا کیسے بن سکتی ہے، دین ظاہری کے لئے یہ تلخ پیالہ روا رکھا گیا بلکہ ضروری ٹھہرایا گیا اس لئے اسکو اسے خواہ مخواہ پینا ہے ــ یہ فرق کیوں رکھا گیا اس لئے کہ دین باطنی انسانی اختیار سے باہر کی چیز ہے، دین ظاہری اختیار انسانی کے اندر کی چیز ہے، پس ایک جگہ جبر برتا گیا دوسری جگہ قدر

اعتقادیات (ایمانیات)

(۱) اعتقادیت زندگی کی بنیادی جوہریت ہے اعتقادی زندگی کا وہ جوہر ہے جو زندگی کو
زندگی بناتا ہے اعتقادیت نہ ہو تو زندگی موت بن جاتی ہے کبھی حقیقتاً کبھی حکماً کبھی
دیوانگی طاری ہو جاتی ہے اور دیوانگی موت لا دیتی ہے کبھی حیرانگی مسلط ہو جاتی
ہے حیرانگی تعطل پیدا کر دیتی ہے تعطل موت تو نہیں ہے مگر نیم موت یقیناً ہے ۔۔۔ حقیقی
زندگی جو حکمی موت کی بھی ضد ہے عمل زندگی ہے مگر معطل زندگی ۔۔۔ بے اعتقادی
معطل زندگی کو یقیناً فنا کر دیتی ہے اور کبھی کبھی نفس زندگی کو بھی جام فنا پلا دیتی ہے ۔۔۔
پس اعتقادیت اختیار کرو یعنی با اعتقاد ہوئے اعتقادیت رہو تا کہ حقیقی زندگی عاملانہ
زندگی کے مالک بن سکو اور موت غیر طبعی سے وہ حقیقتاً ہو یا حکماً محفوظ رہ سکو ۔۔۔ بے اعتقادی
تمہیں دیوانگی یا تذبذب و تحیر میں پھنسا کر حقیقی اور عاملانہ زندگی سے یکسر محروم کر دیگی
اور غیر طبعی موت کا شکار بنا دے گی اور یہ جتنا بڑا خسارہ ہے ظاہر ہے ۔

(۲) اعتقادیت میں بھی لحاظ رکھو کہ خوش اعتقادی میسر ہو بد اعتقادی نہ لپٹ جائے
۔۔۔ بد اعتقادی زندگی کو موت تو نہیں بنا ڈالتی اسی لئے بد اعتقادی بے اعتقادی سے
بہتر ہے پھر بھی زندگی کو بری زندگی یقیناً بنا دیتی ہے اور یہ کبھی چھوٹا خسارہ نہیں ہے
بڑا اور بہت بڑا خسارہ ۔۔۔ بد اعتقادی دیوانگی یا حیرانگی نہیں لاتی اس لئے موت
یا تعطل تک نہیں پہنچاتی مگر جہالت اور ضلالت تو ضرور ہی لاتی ہے جہالت انسانیت کو
قتل کر دیتی ہے ضلالت سعادت کو روک دیتی ہے اور اس کی جگہ شقاوت کو داخل
کر دیتی ہے ۔۔۔ انسان انسانیت سے محروم ہو جائے تو انسانی زندگی سفلی زندگی
بن جاتی ہے۔ سفلی زندگی مختصر بھی ہوتی ہے اور پر ضرر بھی تب جہالت زندگی کو مختصر
اور پر ضرر بنا دینے والی چیز ہے ۔۔۔ شقاوت زندگی کو پر مصائب بھی بنا دیتی ہے اور
بے وسائل بھی کر دیتی ہے ۔۔۔ تب بد اعتقادی بھی زندگی کے لئے خاصی مصیبت ہے
۔۔۔ تب بد اعتقادی ہی سے دور بھاگو جیسا کہ بے اعتقادی سے ۔

(۳) اعتقادیت اور خوش عقیدگی کی افادیت کی بنیادی شرط یقینیت اور صداقت ہے۔ اعتقادیت اور خوش عقیدگی تب ہی فائدہ مند ہو سکتی ہیں جب یقین اور سچائی کے ساتھ با اعتقاد ہوں گے اور خوش عقیدہ ہوں۔ اعتقادیت اور خوش اعتقادی تب ہی فائدہ پہنچائے گی اور وہی فائدے پہنچائیں گی جن کے لئے زندگی بے قرار ہے ۔۔۔ جھوٹی اعتقادیت اور جھوٹی خوش عقیدگی کسی کام کی نہیں ہیں، یہ سچ ہے کہ وہ کبھی دوسروں کو فریب دے کر ان سے کچھ سطحی فائدے دلوا دے سکتی ہیں مگر فریب بازی کا جتنا نفع نہیں ہے اتنا نقصان ہے۔ فریب بازی جتنا فائدہ دیتی ہے اس سے زیادہ نقصان دیتی ہے۔ فریب بازی جبلت کو جھوٹی بنا دیتی ہے جس سے وہ سچ سے بیگانہ ہونے لگتی ہے اور جھوٹ سے لپٹنے لگتی ہے اور اس وجہ سے وہ سچ کی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور یقین کرو کہ سچ کی برکتیں جھوٹ کی منفعتوں سے کہیں زیادہ ہیں ۔۔۔ مذبذب اعتقادیت اور مذبذب خوش عقیدگی کا نقصان یہ ہے کہ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں، فائدے کا تصور کرا سکتی ہیں، فائدے کی راہ تیار کر دے سکتی ہیں، فائدے کو قریب لا دے سکتی ہیں مگر فائدے کو تمہارے ہاتھ میں دے دیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ ان کا تذبذب انھیں آخیر تک کارفرما نہیں رہنے دیتا کہ ان کا کام پورا ہو اور ان کے کام کا نتیجہ نکلے جو کہ فائدہ کہلاتا ہے۔ ہمیشہ ادھورا کام، نتیجہ غائب، فائدہ گم ۔۔۔ بس جھوٹی اعتقادیت اور جھوٹی خوش اعتقادی سے اور اسی طرح مذبذب اعتقادیت اور مذبذب خوش اعتقادی سے اتنا ہی دور بھاگو جتنا بے اعتقادی اور بد اعتقادی سے تاکہ تمہاری زندگی سچی اور پر فائدہ زندگی بن سکے ۔۔۔ با عقیدہ بننا یہ ہے کہ زندگی سے متعلق جو حقیقتیں ہیں انھیں پہچانو اور مانو، ان کی اصلیت اور معقولیت پر اعتقاد قائم کرو مثلاً یہ کہ زندگی کا سب سے ابتدائی اور سب سے بڑا سرچشمہ ذات الٰہی ہے ۔۔۔ زندگی قانون عمل جزا کے ماتحت چل رہی ہے ۔۔۔ زندگی اچھے عمل سے اچھی بنتی ہے۔ برے عمل سے بری ۔۔۔ سچا با عقیدہ بننا یہ ہے کہ جس عقیدے کو ظاہر کرتے ہو اس کو ظاہر ہی نہیں کرتے ہو بلکہ فی الواقع مانتے بھی ہو یعنی دل سے بھی مانتے ہو جیسا کہ زبان سے مانتے ہو ۔۔۔ یقین با عقیدہ بننا یہ ہے کہ جب کسی عقیدے کو مانو تو یقین کے ساتھ مانو تذبذب کے ساتھ نہ مانو

اس وقت تک کسی عقیدے کو نہ مانو یا کسی خیال کو عقیدہ مت بناؤ جس وقت تک اس پر یقین قائم نہ ہو جائے اور جب ایک بار کسی عقیدے کو قائم کر لو تو اس پر جم جاؤ، اس میں تذبذب کو راہ مت کرنے دو البتہ اگر اس کے خلاف کوئی قطعی یقین اور دلیل قائم ہو جائے تب اس کو چھوڑ دو اس سے پہلے نہ اس سے دستبردار ہو نہ اس کا تذبذب گوارا کرو، دیکھو غرض کہ پکڑنے میں بھی پختگی ہو چھوڑنے میں بھی پختگی ہو اور ناپختگی کی منزل کبھی نہ آنے پائے — یاد رکھو کہ وہم اور گمان یا شک تردد عقیدے کیلئے ناکافی ہیں، محض وہم، گمان، تردد و شک کی حالت میں خیال کو عقیدہ بنا ڈالنا جہالت ہے — وہمی گمانی شکی عقیدے کی ایک پہچان بھی ہے، اس پہچان کو یاد رکھو، پہچان عمل کی ناپختگی ہے — جب عمل کو ناپختہ پاؤ تب سمجھ لو کہ اس عمل کا جس عقیدے سے تعلق ہے وہ یقین کی منزل میں نہیں ہے۔ وہم گمان شک کی منزلوں میں سے کسی منزل میں ہے۔ یہ بھی جان لو کہ تذبذب عقیدے کی ضد ہے جیسا کہ جھوٹ عقیدے کی ضد ہے — عقیدے کو پختہ اور یقینی اور اصلی اور صادق بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ عقیدے کے معاملہ میں حقیقت کے سوا کسی اور چیز پر نظر نہ کرو اور دلیل کے سوا کسی کا اثر نہ لو، دلیل میں بھی برہانی اور قطعی دلیل کے سوا کسی دوسری قسم کی دلیل کو خاطر میں نہ لاؤ، تحقیق سے واسطہ رکھو، تقلید کو پاس بھی مت پھٹکنے دو۔ خود غور و فکر کرو، دوسروں کے غور و فکر پر بھروسہ مت کرو۔ غور و فکر کے بعد دل کی گواہی سے بھی کام لو، غور و فکر میں جو بات خود نہ معلوم اس کو جاننے والوں سے بھی پوچھو مگر نتیجہ خود نکالو اور نتیجے کو اپنے ہی فیصلے کے ماتحت رکھو — ایک بڑی بات یہ بھی ہے کہ تمام اسباب عقیدہ سازی کو ربانی رکھو، نفسانی مت بننے دو، کارروائی عقیدہ سازی میں نفسانیت کو کہیں بھی نہ گھسنے دو، ورنہ محنت رائگاں جائے گی اور نتیجہ غلط نکلے گا، یعنی ربانی نفس، ربانی فکر، ربانی استفادہ، ربانی فیصلہ سے کام لو اور اس طرح اپنی تحقیق کو ربانی تحقیق بناؤ، نفسانی نفس، نفسانی فکر، نفسانی استفادہ، نفسانی فیصلے سے بچو —

خوش عقیدہ بننا یہ ہے کہ صرف اچھے عقیدے اختیار کرو، برے عقیدوں کو نہ اختیار کرو۔ اچھے عقیدے وہ ہیں جو اچھے کاموں کی ہدایت کریں، برے عقیدے وہ ہیں جو برے

کاموں کی ہدایت کریں —

اچھے عقیدے حاصل کرنے کے لئے ایک بات کا علم نہایت ضروری ہے، وہ کیا؟ وہ یہ کہ اچھے عقیدوں کے چار بنیادی ماخذ ہیں، دین فطرت، حکمت ربانی، عقل ربانی — اچھے عقیدے حاصل کرنے کے لئے ان چاروں ماخذوں کو برتنا چاہیئے اور ان چاروں ماخذوں کو صحیح برتنے اور ان سے صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے فکر ربانی درکار ہے —

دین اس لئے اچھے عقیدوں کا ماخذ ہے کہ دین قانون الٰہی ہے، قانون الٰہی کبھی برے عقیدوں کا منبع نہیں بن سکتا۔ فطرت اس لئے اچھے عقیدوں کا ماخذ ہے کہ فطرت ہی دین کا اصلی اور مستقل مستقر ہے، اور دین اچھائیوں ہی کا مخزن ہے تب فطرت بھی صرف اچھائیوں کا مخزن ہو سکتی ہے، برائیوں کا نہیں — حکمت ربانی اور عقل ربانی اس لئے اچھے عقیدوں کے مخزن ہیں کہ یہ دونوں دین اور فطرت ہی کے پرتو ہیں۔

(۲) اعتقادیت کی ہدایت دین کی پہلی تعلیم ہے اور اعتقادیات کا باب دین کا پہلا باب ہے۔

(۳) وہ کون سے عقیدے ہیں جو مسلمہ طور پر اچھے عقیدے کہلا سکتے ہیں، ایسے بھی عقیدے ہیں جو ان چاروں سے پیدا ہوتے ہیں، نمونے کے طور پر چند عقیدے یہاں پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ باقی عقیدے بہت ہیں۔ اللہ کا عقیدہ، رسول کا عقیدہ، فرشتوں اور صحیفوں کا عقیدہ، قیامت اور جزا و سزا کا عقیدہ، عمل اور جزا کا عقیدہ —

برے عقیدے کون ہیں وہ جو ان چاروں کے بتائے ہوئے عقیدوں کے مخالف ہیں۔ — اچھے عقیدے کو ربانی عقیدے برے عقیدے کو نفسانی عقیدے بھی کہہ سکتے ہیں اور یہی زیادہ موزوں ہیں کیونکہ وہ اچھائی اور برائی کی علت کا بھی پتہ دیدیتے ہیں —

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ دین تو مختلف ہیں پھر دین کے ہر عقیدے کو ربانی عقیدہ کیسے مان لیا جائے حقیقت یہ ہے کہ دین اصولی عقیدوں میں حقیقتاً ہرگز مختلف نہیں ہیں تحریفاً یا تعبیراً مختلف بن گئے ہیں، ذرا سے غور کے بعد اختلافات کے پردے اٹھتے ہوئے نظر آ سکتے ہیں۔ مثلاً توحید کے ایک عقیدے کو لے لو یہ عقیدہ حقیقتاً دین کی ہر شاخ میں یکساں ہے۔ لیکن تحریف یا غلط تعبیری کی وجہ سے مسخ ہو کر بعض شاخوں میں شرک کا

عقیدہ بن گیا ہے لیکن چونکہ توحید کے اشارے کبھی گم نہیں ہیں اس لئے شرک والے دینوں میں کبھی توحید ہی اصل ٹھہرتی ہے ـــــ اس بنیاد پر تمام ادیان الٰہی کو ایک دین سمجھ کر آگے بڑھو اور سب کو عملاً ایک بنیاد بنانے کی کوشش کرو اور وہ یوں ہوگا کہ تحریفات اور غلط تعبیرات کو پہچان لو اور ان کا راز فاش کرکے ان کی اہمیت کو ختم کردو ـــ یہ بھی یقین کرلو کہ ایک وہ دن ضرور آئیگا جبکہ دین کے ہر شعبے میں کثرت فی الوحدت اور وحدت فی الکثرت کا نمونہ جھلکتا ہوگا جیسا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اور وہ وقت یقیناً طلوع کریگا جبکہ زندگی وحدت فی الکثرت کو کلی رنگ میں سمجھ لیگی دیکھ لے گی برتنا شروع کردیگی اور وہی وقت زندگی کی تکمیل کا وقت ہوگا جس میں زندگی کے تمام نقائص سوکھے پتوں کے مانند جھڑ پڑیں گے اور اس کی ساری کائنات نئی کونپلوں کے رنگ میں پھوٹ نکلیگی ـــــ اے انسان اس مبارک وقت کی تمنا میں کر اور اے مسلمان اس مبارک وقت کو نزدیک تر بنا دینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار ـــــ اس کا اکیلا ذریعہ ربانیت کا لگاؤ اور نفسانیت کا ستھراؤ ہے پس ربانیت سے لگاؤ پیدا کر اور نفسانیت کا ستھراؤ کر ڈال ـــ ربانیت سے لگاؤ پیدا کرنے کا پہلا زینہ ربانی عقیدوں کو اختیار کرنا اور نفسانی عقیدوں کو طلاق دیدینا ہے پس ربانی عقیدوں پر جم جا اور نفسانی عقیدوں سے توبہ کرلے ـــــ

یہ بھی یقین کر کہ اسلام اور اسلام محمدی ہی انسانی ظاہری دین کی جامع ترین اور کامل ترین صورت ہے تمام انسانی ظاہری ادیان انسانی ظاہری دین کی صرف شاخیں ہیں اور اسلام محمدی دین کا پورا درخت ہے ایسا درخت جس کی جڑیں پاتال میں ہیں اور شاخیں آسمانوں پر ـــ اور اس لئے تمام شاخوں کو جو علیحدہ جا پڑی ہیں اسی درخت سے پیوند کرو پھر دیکھ کر دین کا تنا ور اور گھنیرا درخت کس طرح پوری انسانیت کو اپنے سائے میں سمیٹ لیتا ہے اور انسانیت اسکے سائے تلے کیسی آسودگی کو پہنچ جاتی ہے۔

مبارک ہو اے انسان اور اے مسلمان اگر تو اس سب سے بڑی مبارک مہم کو اپنی ہمتوں اور عزیمتوں کے ذریعے انجام تک پہنچا دے ـــــ مثلاً توحید کو جس کی اسلام محمدی نے اس زور شور سے تعلیم دی ہے مرکزی عقیدہ بنا کر تثلیث، تثنیہ، تکثیر تا محدود کو اس طرف

راضی کر دو — جو بہت آسان چیز ہے، اس لئے کہ اسلام محمدی نے اس کو اس شرح و
بسط اس زبردست استشہاد و استدلال اور ایسے دلآویز و دلربا ڈھنگ میں پیش کیا ہے
کہ اس کی پرجلال روشنی کے سامنے تمام شرکی روشنیاں ماند پڑ چکی ہیں — پھر یہ یقین
کر وا اور یہ یقین دلاؤ کہ تمام ادیان الٰہی ایک ہی ہیں، ایک ہی سورج کی کرنیں، ایک ہی
پھول کی پنکھڑیاں، ایک ہی سمندر کی لہریں، ایک ہی درخت کی ٹہنیاں۔ ان کا اختلاف
صرف تنگی نظر کا نتیجہ ہے اور قلت علم و فکر کا ثمرہ جہاں نظریں پھیلاؤ اور علم و فکر میں گہرائی
پیدا ہوا یہ سارے اختلاف وحدت کے نقطے میں سمٹ آئیں گے اور وحدت ہی وحدت
دل کی آنکھوں کے سامنے ناچتی دکھائی دینے لگے گی۔

ایک اور بات بھی سمجھنے کی ہے جس طرح سابقہ ادیان الٰہی ایک ہی دین کی جس نے
اسلام محمدی کی جامع ترین اور کامل ترین صورت میں آخر آخر ظہور فرمایا ہے۔ شاخیں
ہیں ویسے ہی تمام حکمتی مذاہب ہی جو اسلام محمدی کے ظہور کے بعد نمودار ہوئے ہیں
اسی دین کی تفسیری شاخیں ہیں اور قدرت کے اشارے سے ان کا نمود اسی لئے ہوا ہے
کہ اسلام محمدی کی صورت جامعہ والے دین کی وہ باریک شرحیں آشکارا کردیں جو اس کے
کم علم پیرووں سے مخفی رہ گئی تھیں — یہ سمجھ کر ان کی بیگانگی کو بھی ختم کر دو اور ان کی
مخالفت کی بدگمانی کو بھی دھو ڈالو اور انہیں بھی اسلام محمدی سے جو دین کی صورت جامعہ
اور حیثیت کاملہ ہے جس کے بعد دین کا کوئی نئی صورت و حیثیت اختیار کرنیوالا نہیں ہے۔ جوڑ دو
جس طرح کٹی ہوئی شاخیں جوڑ دی جاتی ہیں — یقین کرو کہ اس عمل میں اسلام محمدی اور
دین کا نقصان نہیں ہے نفع ہی نفع ہے اسی طرح انسانیت کا فائدہ ہی فائدہ ہے —
اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لو اور یاد رکھو کہ آخری دین الٰہی یعنی اسلام محمدی اتنا تنگ
نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے جتنا تنگ اس کے موجودہ کم نظر پیرووں نے سمجھ رکھا ہے جامع
اور کامل ابدی اور دائمی دین بھلا تنگ ہو سکتا ہے اور اتنا تنگ کہ ہر پرانی اور نئی خوبی اور
ہر ایسی راہ جو انہیں بتائی ہے اس کے دائرے سے باہر اور اس سے کشمکش اور جنگ۔
یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، اس کے بالکل برعکس اس کو وسیع ہونا چاہیئے اور اتنا وسیع کہ ہر خوبی

خواہ پرانی ہو، خواہ نئی اور ہر ایسی راہ جو کسی خوبی کو دکھاتی ہو خواہ نئی اسکے اندر دکھائی دینی چاہئے
۔۔۔ پس یقین کرو کہ اسلام محمدی دین کامل اور دین دائم کی حیثیت سے تمام ادیان سابقہ پر بھی
حاوی ہے اور ان تمام اچھی حکمتوں اور حقیقتوں پر بھی حاوی ہے جو وقتاً فوقتاً قیامت تک
حکمت ربانی اور فکر ربانی کی مدد سے ظاہر ہوتی رہیں گی ۔۔۔ اسلام محمدی کی تفسیر و تشریح
میں ہرگز اس تنگی کو روا نہ رکھو کہ وہ دوسروں تو دوسروں خود اپنوں کو بھی سمیٹنے کے قابل
نہ رہ جائے اور ہر زمان و مکان میں ہر حال و احوال میں سلسلہ رانی کی سی چلن کے لائق نہ ٹھہرے
بلکہ اسکی تفسیر و تشریح میں اتنی نامحدود وسعت برتو کہ ہر شخص اس سمندر میں پل سکے اور ہر گوشہ
اس وحدت میں گم ہو جا سکے ۔۔۔ اس دھوکے سے بھی نکل جاؤ کہ دین کے تمام عقائد
حقائق بالکل سطحی اور عامیانہ محض سیدھے سادے ہوتے ہیں جن تک ہر عامی اور جاہل کی
پوری گزر ہوتی ہے اور دین تمام اسرار و رموز سے یکسر خالی ہوتے ہیں گویا خواص کے لطیفہ
ذائقہ اور تجسس اسرار و رموز کی طلب و آسودگی کے لئے ان میں کچھ نہیں ہوتا ۔۔۔ یاد رکھو کہ
ایسی بدگمانی دین کی سخت توہین و تذلیل ہے اور اس کا اور خود انسانیت کا سخت
نقصان و خسران ہے ۔۔۔ اس حقیقت کو سمجھو اور یاد رکھو کہ دین جہاں ایک پہلو سے
اور وہ ضرورت عامہ کا پہلو ہے انتہائی سادہ اور سطحی ہے وہیں دوسرے پہلو سے اور
وہ ضرورت خاصہ کا اور ارتقاء و تکمیل ذہن کا پہلو ہے انتہائی دقیق اور عمیق بھی ہے اور
اس طور پر دین جہاں عوام کے واسطے دستور ہدایت ہے وہیں خواص کیلئے نسخۂ حکمت اور
صحیفۂ حقیقت بھی ہے ۔ دستور ہدایت کی حیثیت سے مشترک ہے جسکے مخاطب عوام اور
خواص دونوں ہیں نسخۂ حکمت اور صحیفۂ حقیقت کی حیثیت سے خواص کیلئے مخصوص مگر وہ مخصوص
نہیں جو عوام کے لئے ممنوع ہو بلکہ ایسا مخصوص جو عوام کو بھی صلائے عام دیتا ہے کہ اگر تم ترقی
ذہنی کر کے خواص بن جاؤ تو تم بھی اس ایوان امارت میں داخل ہو سکتے ہو اور اسکی شش جہت
کی سیر کر سکتے ہو ۔۔۔ دین کی اس جامع الحیثیات شان کو ملحوظ رکھ کر دین کو دیکھو اور
اسکے سادہ اور سطحی عقیدوں اور اظہاروں کو سادگی کے رنگ میں مان لو حالانکہ اسکی سادگی
میں بھی گہرائیاں ہیں اور اسکی سطحیت میں بھی جوہریت ہے جو گہرے غور و فکر کے بعد ابھرتی

ہیں اور خواص ہی پڑا کرتی ہیں تب اس کے گہرے اور باریک عقیدوں اور مسئلوں کو بجنسہ بلا تاویل مان کر ان کی تفتیش و تحقیق میں لگے رہو اور اپنے ذہن و فکر اور علم و فہم کو ترقی دیتے ہوئے اس کا انتظار کرو کہ کب وہ تم پر صاف و واضح رنگ میں کھل جاتے ہیں اور بھروسہ رکھو کہ زمانے کے امتداد ذہن و علم کی ترقی اور جستجو و آرزو کے تسلسل کے ذریعے ایک وہ وقت ضرور آئیگا جب یہ باریکیاں اور پیچیدگیاں تم پر اس طرح کھل جائینگی جس طرح نہ کھلنے والی گرہیں کچھ وقت لیکر کھولتے کھولتے کھل جاتی ہیں — مگر یہ حماقت نہ کرو جیسا کہ بہتیرے بدنصیب حماقت پیشہ کرتے ہیں کہ جلد بازی اور مصلحت بینی کو راہ دیتے ہوئے تحریف و تاویل کی قینچی لے کر یہ پکارتے ہوئے کہ دین محض عامیوں کے لئے ہے اور دین میں کوئی پیچیدگی نہیں، ان گہرے اور باریک عقیدوں اور مسئلوں کو کتر ڈالتے ہیں اور انھیں مسخ کر کے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں — یہ کام دین اور انسانیت دونوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور کام کرنے والے کو گمراہی اور تباہی کے غار میں ہمیشہ کے لئے ڈھکیل دیتا ہے — دینی عقیدے دو قسم کے ہوتے ہیں بنیادی اور بالائی، بنیادی عقیدے صرف سادہ اور عمومی ہوتے ہیں، ان کا جاننا اور ماننا ہر انسان کے لئے ضروری رکھا گیا ہے بالائی عقیدے سادہ اور پیچیدہ دونوں قسم کے ہوتے ہیں، ان کا اقرار و اختیار تفصیل و امتیاز کے ساتھ ہر ایک پر واجب نہیں ہے بلکہ دین کے اعتقاد کلی کے ضمن میں ان کا اجمالی اعتقاد کافی ہے — پس اسی رنگ میں دین کے عقیدوں کو قبول کرو — پھر یہ کہ بنیادی عقیدے چونکہ زیادہ اہم ہوتے ہیں انہیں ٹھوک بجا کر ہی قبول کرو، یہاں بے تحقیق ایمان بے قیمت ہے، با تحقیق ایمان ہی قیمت رکھتا ہے پس یہاں تقلید پرست نہ بنو، تحقیق سے کام لو، تحقیق بھی مکمل قسم کی ہو جس کا نقشہ ایک مقام پر بتایا گیا ہے، ناقص قسم کی تحقیق نہ ہو جس میں بہتیرے محققین بھی پھنس رہتے ہیں — مثلاً قلبی شہادت بھی ایک قسم کی تحقیق ہے مگر کامل تحقیق نہیں ہے جب تک برہانی دلیل بھی اس کی تصدیق نہ کر دے، اسی طرح برہانی دلیل بھی ایک قسم کی تحقیق ہے مگر ناقص تحقیق جب تک قلبی شہادت اس کو مضبوط نہ کر دے۔

(۴) اعتقادیت، استقامت کے ساتھ ساتھ اخلاصیت و فدائیت بھی ڈھونڈھتی ہے، جس عقیدے کو ایک بار قبول کر لو اس کے لئے اخلاص اور فدائیت کو بھی لازمی کر لو۔ اس کو دھوکا نہ دو کہ جب تک اس کا ساتھ دینے میں ہرج نہ ہو ساتھ دیتے رہو جب کچھ ہرج برج دکھائی دینے لگے غریب کا ساتھ چھوڑ دو نہیں جب تک اسکو صحیح سمجھتے رہو ساتھ دیتے رہو، اس کی حرمت کرتے رہو اور یہاں تک کرتے رہو کہ ضرورت آن پڑے تو اپنے کو قربان کر دو ـــ عقیدے کی حرمت حقیقت کی حرمت ہے، عقیدے کے لئے قربانی حقیقت کے لئے قربانی ہے ـــ حقیقت کے برابر کوئی چیز نہیں ایک حقیقت لاکھوں زندگیوں سے بڑی ہے اور اس کا قدرتی حق رکھتی ہے کہ کھرے کھرے لاکھوں زندگیوں کو قربان کر ڈالے ـــ حقیقت ہی برکتوں کا سرچشمہ ہے، اگر حقیقت قائم ہے تو تم نہ سہی بے شمار زندگیاں اس سے برکتیں سمیٹیں گی، لیکن اگر تم قائم ہو اور حقیقت مٹ گئی تو تم بھی برکتوں سے محروم اور کروڑوں دوسرے بھی برکتوں سے محروم ـــ سوچو تو یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔

(۵) اعتقادیت ایک اور بڑی چیز چاہتی ہے وہ عملیت ہے جو عقیدہ رکھو اسپر عمل بھی کرو، بے عمل اعتقاد بے اعتقادی کے برابر ہے بلکہ بے اعتقادی سے بدتر ہے، بے اعتقادی عقیدے کی توہین نہیں کرتی صرف مخالفت کرتی ہے یا بیگانگت دکھاتی ہے، بے عملی عقیدے کی توہین کرتی ہے اس کی ہستی اڑاتی ہے ـــ گو بعض صورتوں میں بے کسی اور کمزوری کا اظہار بھی کرتی ہے مگر یہ احتیاطی اور اتفاقی چیز ہے مستقل اور اصلی چیز یہی ہے ـــ اس سے بھی زیادہ یہ ہے کہ بے عملی جھوٹ کو پھیلاتی ہے ـــ بے عمل کو جھوٹا ثابت کرتی ہے اور عقیدے کو بھی جھوٹا بناتی ہے ـــ پھر بے عملی ایک وبا کا اثر رکھتی ہے اور چھوت والی بیماری ہے، ایک بے عمل سے دوسروں میں پہونچتی ہے اور انہیں بھی بے عمل کر دیتی ہے، اگرچہ مضبوط لوگ بچ سکتے ہیں مگر کمزوروں کا صفایا ہو جاتا ہے ـــ تب بے عملی شخصی ہی گناہ نہیں ہے جماعتی گناہ بھی ہے ـــ پس بے عملی سے بچو اگر نہ بچ سکو تو عقیدے سے بیزاری کا اعلان کر دو تاکہ

تباہی تمھیں بیں گھر کر رہ جائے اور جماعت بڑی حد تک پناہ پا جائے۔ عقیدہ مقصد نہیں وسیلہ ہے وسیلہ موجود ہو اور مقصد غائب کیسا دردناک سانحہ ہوگا، پھر عقیدہ بلا عمل اس خزانے کے مانند ہے جس پر ہمیشہ قفل پڑا رہے۔ ایسے خزانے کے خزانہ دار ہیں اور قلاش ہیں کیا فرق۔ پھر عقیدے کو اس شدت سے مانو کہ جذبہ بن جائے عمل بن جائے اور اس طور سے عقیدہ زندگی بن جائے۔ اگر اس شدت سے نہیں مان سکتے تو پھر عقیدے کا پیچھا چھوڑ دو، بے شدت عقیدہ جو عمل بن کر پھوٹ نہیں پڑا عقیدہ نہیں ہے تصور ہے تخیل ہے، خواب ہے، سراب ہے۔

(۶) اعتقادیت دعوت و تبلیغ کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ جس عقیدے کو قبول کرو اس کو دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اگر تم ایک خزانہ رکھتے ہو تو اس کو بانٹو کہ دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں یہ کیا کہ خزانے پر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے رہو۔ دعوت و تبلیغ سے پرہیز یا تمھارے بخل و حسد کی یا تمھاری غفلت و لاابالیت کی یا تمھاری کم اعتقادی کی خبر دیتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں بری ہیں۔ (۷) اعتقادیت کا سب سے پہلا موضوع دین ہے۔ سب سے پہلے دین ہی پر اعتقادیت کا تجربہ کرو، اگر تحقیق اور تلاش سے دین کی معقولیت اچھی طرح ثابت ہو جائے تو دین پر اعتقاد جماؤ اور اعتقاد کے بعد زندگی کو دین کے حوالے کر دو ——— اور سنو کہ جیسا پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ دین اتنی روشن اتنی قطعی اتنی فطری اتنی ناگزیر چیز ہے زندگی کی مانند کہ اگر دماغ خراب نہ ہو اور فکر درست ہو تو جس طرح زندگی پر اعتقاد لائے بغیر چارہ نہیں، دین پر بھی اعتقاد لائے بغیر چارہ نہیں۔

پس دین پر ضرور اعتقاد لاؤ۔ دین سے بے اعتقادی دراصل زندگی سے بے اعتقادی ہے اگرچہ اس کا نام زندگی سے بے اعتقادی نہیں رکھا گیا ہے۔ غفلت و لاابالیت کیا چیز ہے۔ بے اعتقادی خواہ چھپی ہوئی بے اعتقادی ہی ——— دین اور زندگی میں کوئی تعلق ہے یا نہیں اس پر غور کرو ——— دین اور زندگی میں ایک قدرتی تعلق ہے، ٹھیک اسی طرح کا تعلق جس طرح کا زندگی اور عقل میں قدرتی تعلق ہے ———

عقل زندگی کی حاکم ہے، عقل نہ رہے تو زندگی بے حاکم و بے حکومت ہوکر بے راہ اور تباہ ہو جائے گی، دین بھی عقل کے واسطے سے زندگی کا حاکم ہے، اس طرح کہ دین عقل کا حاکم ہے، عقل زندگی کی حاکم ہے —— پس اگر دین زندگی کا نہ رہے اور زندگی بے دین کے چلے تو زندگی بے راہ اور تباہ ہو جائے گی —— ایک اور طرح سے دین کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہو۔ دین زندگی کا قانون ہے، وہ قانون نہیں جس کو انسان گڑھ لیتا ہے، بلکہ وہ قانون جو فطری ہے، خلقی ہے، الٰہی ہے جس کو علیم و خبیر سمیع و بصیر ذاتِ الٰہی نے فطرت کائنات میں اور باطن زندگی میں بطور حقیقت ودیعت فرمادیا ہے۔ زندگی اپنے فطری قوانین سے لڑ کر کہاں پہونچے گی، غارِ ہلاکت کے سوا اور کہاں۔ پس دین کے بغیر زندگی تباہ۔ پس دین کا اعتقاد کے ساتھ ضروری رشتہ ہے۔ دین کا پہلا مجوّزہ اور حکم اعتقادیت ہے۔

(اصلاحِ نفس) نفسیّات (ذہنیات) (درستیِ نفسیّات)

(۱) نفس یعنی ذہن کو اعتقادیات کے ماتحت قوتِ ارادی کے اثر سے اور جائزۂ حالات اور اصلاحِ حالات کی مشق سے ہمیشہ تیار اور مستعدِ کار رکھو اور درست اور چست بناتے رہو تاکہ ذہن ناتیاری نامستعدی نادرستی اور سستی کے روگ سے بچا رہے اور زندگی کو اس نقصان سے بچاتا رہے جو اس راستے سے اسکو پہونچ سکتا ہے —— ذہن کو ہمیشہ متفکر اور مفکر رکھو، یعنی سوچنے والا اور غور و فکر کرنیوالا۔ ذہن کو لاابالی اور غور و فکر سے خالی مت بننے دو۔ لاابالیت اور خلوئیت، ذہن کو معرفت طلبی اور حقیقت رسی کی قابلیت سے خالی کر دیتی ہیں اور معارف و حقائق کی ہوا سے بھی دور ڈالدیتی ہیں۔ لاابالیت اور خلوئیت کو جن اشغال اور حالات سے ہوا ملتی ہے ان سے الگ تھلگ رہو۔ پھر ان اشغال و اعمال سے لپٹے رہو جو ذہن کو مصروفیت و استغراق سکھاتے ہیں اور درستی و چستی کی کیفیات بخشتے ہیں —— قوتِ ارادی کو نشوونما دیتے رہو، اسکو موثر بنانیکی مشق کرتے رہو، یہاں تک نشوونما دو اور یہاں تک مشق بڑھاؤ کہ قوتِ ارادی میں کن فیکون کا انداز جھلکنے لگے

اور کردم وشد کا زنگ پیدا ہوجائے ۔ گویا تمہاری قوت ارادی ظلاً وتبعاً قوت ارادی الٰہی بن جائے یعنی اس کا پرتو ہوجائے ، اور تمہاری زندگی کو اس میں ایسا آلہ بے پناہ مل جائے جو کہیں خطا نہ کرتا ہو، گویا وہ مشیت الٰہی کا مقیاس ہے اور مرضی ربی کا معیار، جہاں وہ ٹھہر گئی گویا مشیت الٰہی ٹھہر گئی، جہاں وہ ڈٹ گئی گویا مرضی ربی ڈٹ گئی، جو کچھ اس نے سوچا گویا مشیت الٰہی نے وہی سوچا اور جو کچھ اس نے چاہا گویا مرضی ربی نے وہی چاہا اور اس کی بدولت تمہارا وجود وجود الٰہی بن جائے اور تمہارے افعال افعال الٰہی کے اظلال ہوجائیں یہاں تک کہ تمہاری زندگی زندگی الٰہی ہوجائے اور یہ کہنا درست ہوسکے کہ جو کارہائے نمایاں تم کر رہے ہو تم نہیں کر رہے ہو ذات الٰہی کر رہی ہے ۔۔ مگر یہ کیونکر ہوگا، یہ اس طرح اور صرف اس طرح ہوگا کہ اپنے ارادے کو ارادہ الٰہی سے وابستہ کردو اور اپنی قوت ارادی کو قوت الٰہی سے پیوستہ بنادو اس اعتقاد اور ایمان کے ساتھ کہ جب جب اور جہاں جہاں تمہاری قوت ارادی ناکام ہوئی ہے تب تب اور وہاں وہاں تمہاری قوت ارادی الٰہی سے گسستہ ہوگئی ہے اور تمہارا ارادہ ارادہ الٰہی سے جدا جا پڑا ہے ـــــ تم شاید کہو گے کہ کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے کہاں انسان اور کہاں اللہ۔ ہاں یہ ممکن ہے اور ممکن ہی نہیں یقینی ہے البتہ اس ناممکن کو ممکن اور اس مشکوک کو یقینی بنانے کے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ اپنی ذات کو ذات الٰہی میں فنا کرنا سیکھ جاؤ اور فنا کردو۔ اگر ایسا کرسکو اور کر ڈالو تب یہ ہوجائے گا میرے عزیز کہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

جائزہ حالات اور اصلاح حالات کی مشق بھی ساتھ ساتھ رکھو ـ یہ جانچتے رہو کہ حالات کیا ہیں، ارادے کیسے ہیں، قوت ارادی کس درجے پہ پہونچی، قوت ارادی کہاں کامیاب ہوئی اور کیوں ناکامیاب ہوئی کہاں ناکام ہوئی اور کیوں ناکام ہوئی ـ جہاں ناکامیاں ہوئی ہوں وہاں وہاں کے اسباب ناکامی اور وجوہ ناکامی کو بخوبی پہچان لو اور آئندہ انھیں بدل ڈالو، جو جو ارادے غلط ٹھہریں ان سے آئندہ کے لئے دست کش ہوجاؤ ـــ ایک بنیادی بندوبست ارادے اور قوت ارادی کو درست اور چست بنانے کا یہ ہے کہ اپنے خلیفۃ اللہ تصور اور یقین خلیفۃ اللہ کے تصور و عقیدہ کو خوب خاطرنشین کرلو یہاں تک کہ تمہارا

رہ گئے اور تم لوگ نحن خلیفۃ اللہ پکارنے لگے اور تمہارا ظاہر و باطن نشۂ خلیفۃ اللہیت سے مخمور ہوا تھا۔ اور سنو کہ یہ تصور اختراعی تصور نہیں ہے یعنی من گھڑا تصور بلکہ مصدقہ اور مسلمہ تصور اور کتاب الہی کا مصدقہ اور مسلمہ تصور کیونکہ آدم کو خلیفۃ اللہ کہا گیا اور اسکو فرشتوں کا جو ساری کائنات سے افضل اور پوری کائنات پہ حکم الہی سے حاکم ہیں مسجود بنایا گیا اور اس واسطے سے پوری کائنات کا مسجود بنایا گیا اور مسجود حاکم سے بھی بڑا ہوتا ہے پس وہ پوری کائنات کا حاکم بنایا گیا پھر اسکی حاکمیت کلیہ بہ ماتحتی حاکمیت الہیہ مشہور و محسوس بھی ہے، آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ آدم اپنی ذریت کے ذریعے آہستہ آہستہ سہی کائنات پہ حاکمانہ مسلط ہوتا جا رہا ہے اور ارتقائی شان میں کائنات کے ایک ایک رکن کو مسخر کرتا جا رہا ہے۔ اور اس میں بھی کیا شبہ ہے کہ جو طاقتیں آدم کو دی گئی تھیں وہ سب کی سب اسکی ذریت میں بھی مجموعی اور شخصی دونوں طور پہ منتقل کر دی گئیں۔ کیونکہ انسان اجتماعی طور پہ تصرف کے جو کچھ معجزے دکھا رہا ہے دکھا بھی رہا ہے ایک ایک انسان علیحدہ علیحدہ بھی تصرفاتی معجزوں کے انبار لگاتا جا رہا ہے۔ محمد صلعم ایک ہی شخص تھے اور انھوں نے پوری کائنات کو اپنی روحانی قوتوں سے کنگال ڈالا۔ ایک ایک فلسفی اور حکیم ایسا پیدا ہوا جس نے کائنات کی زبردست سے زبردست قوتوں کو مادی طاقت سے مسخر کر لینے کی راہیں نکال دیں یہ اور بات ہے کہ بہتیرے انسان اپنی معجزانہ قوتوں کو نشو و نما نہیں دے سکے —— پس ہر انسان شخصاً بھی خلیفۃ اللہ ہے۔ جیسا کہ نوعاً اور مجموعاً خلیفۃ اللہ ہے پس خلیفۃ اللہیت کے تصور واقعی کو محیط الوجود بنا دینے کی مشق کرتے رہو اور قوت ارادی کو عروج دیتے رہو یہاں تک کہ معراج پہ پہونچا دو۔

(۳) ذہن کو طاہر و مطہر رکھو۔ لغویات و مکروہات کے تصور سے پاک کرتے رہو۔ لغویات و مکروہات کے تصورات ذہن کو ناپاک بنا دیتے ہیں اور اس لائق نہیں رکھتے کہ ضروریات و مستحبات کی طرف ذوق و شوق سے متوجہ ہو سکے اور انھیں یکسوئی کے ساتھ برتنے پہ آمادہ ہو —— لغویات و مکروہات کا علم کافی حاصل کرتے رہنا چاہئے اور ان سے پرہیز کرنے اور دور رہنے کی مشق کراتے رہنا چاہئے —— ذہن کو مرتب اور مصقل بناتے رہو یعنی

عادی بناتے رہو کہ ارادے کرتا ہے اور ارادوں کو پورا کرتا رہنے کی مشق کرتا رہے، مگر
اچھے ارادے اور اچھی تعمیلیں ــــ بے ارادہ اور بے عمل رہنا ذہن کو ناکارہ
بنا دیتا ہے، اگرچہ متفکریت اور مفکریت موجود بھی ہو۔ متفکریت و مفکریت اور
چیزیں ہیں اور مریدیت و متعملیت اور چیزیں۔ (۳) ذہن کو غلط روی اور ماندہ
نشینی سے دور رکھو۔ غلط اور صحیح اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کا عادی بناؤ
اور اس کا خوگر کرو کہ جس چیز کو غلط اور باطل ایک مرتبہ باور کر لے اس سے خود بخود
کترانے لگے۔ تسلسل محنت و مصروفیت کا بھی عادی کر دو، یہ نہ ہو کہ ایک محنت و
مصروفیت کے بعد تھک کر بیٹھ جائے اور دوسری محنت و مصروفیت کی طرف تاکنا
بھی گوارا نہ کرے۔ یہ کرو کہ جونہی ایک محنت و مصروفیت ختم ہو جائے دوسری محنت و
مصروفیت میں فوراً لگا دو۔ تفریح و تنشیط ذہن بیشک ضروری چیز ہے تاکہ ایسا
نہ ہو کہ کثرت بار سے غریب چور اور معذور بن جائے، مگر تفریح و تنشیط کا ذریعہ ایک
لہو و لعب ہی نہیں ہے جیسا کہ لہو و لعب والے تجویز کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرا ذریعہ
تنوعِ مشغلہ کا بھی ہے، یعنی کام کی ایک قسم کو چھوڑ کر دوسری قسم کو اختیار کر لینا اور کام کی
ایک بہترین قسم رجوع الی اللہ ہے ــــ پس یہ کرو اور صرف یہی کرو کہ جب ذہن کو
ایک کام سے تھکا ہوا پاؤ تو اس کو جھٹ رجوع الی اللہ کے کام میں لگا دو اور یقین کرو کہ
اس سے ذہن بہترین فرح و نشاط حاصل کرے گا۔ اس تبدیل کار میں ایک اور نفع بھی ہے
وہ یہ کہ اس سے فرح و نشاط ہی نہیں ملتا اور بدلِ ما یتحلل ہی ہاتھ نہیں آتا۔ اضافہ قوت و
قدرت بھی ہاتھ آتا ہے اور نعم البدل نصیب ہوتا ہے، یہ اس لئے کہ ذات الٰہی ہی قوت و قدرت کا
اصلی مخزن اور نادر ترین مخزن ہے پھر یہ کہ ذاتِ الٰہی وصف ربوبیت کے باعث رجوع کنندہ کو
قوت و قدرت کا نیا ذخیرہ بخشنے کو تیار اور منتظر بیٹھی رہتی ہے، پس ادھر ذہن نے ادھر لو لگائی اور
ادھر وہاں سے اضافہ مربیانہ کا سیلابی دھارا چلا۔ سوچو تو کہ اس سے بہتر تفریح و تنشیط اور کیا ہو سکتی ہے
کہ ہم خرما و ہم ثواب، نشاط کا نشاط اضافے کا اضافہ، پس بدنصیب ہے گا انسان اگر اس بہترین تفریح و
تنشیط کو اور دوسرے لفظوں میں ربانی تفریح و تنشیط کو چھوڑ کر کمترین اور نفسانی تفریح و تنشیط کی

کسی قسم پر جھک پڑے۔ نفسانی تفریح و تنشیط کا ایک سخت نقص و عیب یہ ہے کہ وہ اگر ایک طرف یکسوئی و ستعدی کو بڑھاتا ہے تو دوسری طرف آلودگی و گندگی کو بھی داخل کرتا رہتا ہے ساتھ ہی ساتھ مرکز سے بیگانگی کو بڑھاتا رہتا ہے قوت علوی ربانی سے محروم کرتا رہتا ہے۔ اور علویت و ربانیت سے دور پھینکتا رہتا ہے۔ نفسانی تفریح و تنشیط میں ذہن کو لگانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شکستہ و ریختہ شخص کو بجائے مقوی غذاؤں اور عمدہ یاقوتیوں کے سنکھیا اور شراب سے شگفتہ بنایا جائے جن کی تقویتیں تھوڑی ہیں اور تکسیریں زیادہ۔

(۴۴) ذہن کو تفکر فی اللہ تدبر فی کتاب اللہ تامل فی مصنوعات اللہ کا مجموعًا عادی بناؤ اور انفرادًا نہیں۔ انفرادًا اس لئے نہیں کہ اس میں اگر ایک نفع ہے تو دوسرا نقصان۔ اگر تنہا تفکر فی اللہ کا عادی بناؤ گے تو یہ ہوگا کہ رابطہ باللہ کی نعمت عظمےٰ تو حاصل ہو جائے گی۔ مگر ساتھ ہی نقصان یہ ہوگا کہ ایک طرف معرفت باللہ غلط ہو جائے گی۔ کیونکہ کتاب اللہ کی ہدایتوں سے محروم رہ کر ذہن من مانی معرفتیں پیدا کرے گا جو ہرگز بھروسے کے قابل نہیں ہوں گی اور لازمًا صحیح معرفت الٰہی سے کچھ نہ کچھ دور جا پڑیں گی کیونکہ انسان محدود ہے ذات الٰہی نامحدود۔ محدود نامحدود کی معرفت صحیح حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک نامحدود خود اپنی معرفت نہ کرائے اور اس معاملے میں نبیوں کے اذہان عالیہ پر تو بھروسہ کیا ہی نہیں گیا بلکہ انھیں صاف صاف جتا دیا گیا کہ تم بھٹکے بھٹکے پھرتے تھے اللہ نے تمھیں اپنی کتاب کی معرفت سیدھی راہ پر لگایا۔ پھر عامیوں کے ذہن اور فہم پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مخلوقات سے بددلی گھیر لے گی اور یوں رہبانیت مسلط ہو جائے گی جو بانئ الخلقت انسان کے لئے ایک سخت گھاٹے کی چیز ہے۔ تنہا تدبر فی کتاب اللہ کا عادی بناؤ گے تو نفع یہ ہوگا کہ معرفت صحیح اللہ کی حاصل ہو جائیگی مگر براہ راست تفکر فی اللہ سے محروم ہونیکے باعث نقصان یہ ہوگا کہ رابطہ باللہ سے محرومی رہ جائیگی کتابی علم کتابی بنا کر چھوڑ دیتا ہے اور اس کا جو حشر ہوتا ہے اس کا نظارہ کتابی ملاؤں کی بستیوں میں کیا جا سکتا ہے باوجود اس کے کہ قرآن و حدیث کا پشتارہ پیٹھ سے بندھا ہوتا ہے۔ دل ذوق عشق الٰہی سے اجاڑ کھنڈروں اور خالی قبروں کی طرح بالکل خالی رہتا ہے اور اس خصوص میں ان سے

وہ جاہل کہیں بہتر ہوتے ہیں جن پر تفکر فی اللہ کی بدولت عشق الٰہی کا ایک چھینٹا پڑجاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امی شخصوں کو نبوت وولایت مل جاتی ہے اور بڑے بڑے علما وحکما ان امیوں کی چوکھٹوں پر ناکیں رگڑتے رہتے ہیں یا پھر چوپائے بنے ہوئے آوارہ و ناکارہ پھرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف تامل فی مصنوعات اللہ سے دور رہنے کے سبب معرفت خلق سے محرومی رہ جائے گی اور اس محرومی کی وجہ سے خلقی زندگی ابلہانہ بن جائیگی ــــ لیکن اگر ان تینوں کی مجموعی مشق ہوگی تو یہ نقصانات دور رہیں گے ــــ ذہن کو اس بات کا عادی بناؤ کہ ذات اللہ کا فکر وذکر بھی جاری رکھے، اگر یہ تینوں باتیں ساتھ ساتھ جاری رہیں تو زندگی کامل کی استعداد کامل مل رہے گی اور ربانی زندگی نمودار ہو جائیگی بجائے اسکے نفسانی زندگی مسلط ہو جائے جو عبادت ہے ہیولانی زندگی لاابالیانہ زندگی کا نام ہے رہبانی زندگی تارک الدنیاانہ زندگی کا نام ہے۔ شیطانی زندگی شیطانہ زندگی کا نام ہے ربانی زندگی الٰہیانہ زندگی سے عبارت ہے جو کامل ومکمل زندگی ہے ــــ ذہن کو اس ضابطے پر چلانے کے لئے ذات الٰہی کا اعتقاد رکھنا پڑیگا۔ کتاب الٰہی کا اعتقاد رکھنا پڑیگا مخلوقات کے مصنوعات الٰہی ہونے کا اعتقاد رکھنا پڑیگا، ساتھ ہی یہ پہچاننا پڑیگا کہ تینوں باتیں آپس میں قدرتی ربط رکھتی ہیں اور ان تینوں سے انسانی زندگی قدرتی ربط رکھتی ہے اور جب تک اس ربط الربط کو سامنے نہ بنایا جائے انسانی زندگی فطرتی سانچے میں ڈھل نہیں سکتی بلکہ کسی غیر فطرتی سانچے میں ڈھل جائے گی۔ غیر فطرتی سانچے میں ڈھل کر مسخ اور مبتذل ہو جائے گی اور یوں حقیقی فوز وفلاح سے کنارے جا پڑیگی ان اعتقادوں کے ساتھ ساتھ ان تینوں کا علم ومشق بھی حاصل کرنا پڑیگا تاکہ ان کی مدد سے زندگی کے رستے کی رہبری باخبرانہ وذوق مندانہ ہو بے خبرانہ وبے ذوقانہ نہ ہو

ــــ علم اللہ یا علم الالٰہیات کو کتاب اللہ، حدیث رسول اللہ، تاریخ رسول وصحابہ سے حاصل کرنا ہوگا مگر فکر ربانی اور استفادہ ربانی کی مدد سے ورنہ صحیح علم کے بجائے غلط علم کا اندیشہ ہے ــــ علم کتاب اللہ کو علم اللہ اور علم مصنوعات اللہ کی مدد سے حاصل کرنا پڑیگا علم مصنوعات اللہ یا علم الکونیات کو علم اللہ اور علم کتاب اللہ کی روشنی میں فکر وکیمیانہ سے

کسب کرنا پڑے گا ورنہ بہک جانے کا ڈر ہے۔

(۴) دین کو عبادت الٰہی و اطاعت الٰہی کی طرف بھی مائل رکھو ورنہ ممکن ہے کہ تفکر و تدبر محض پیدا کر دین یا رہبانیت مسلط کر دیں یہ بھی غیر ممکن نہیں ہے کہ شیطانیت کی طرف کھینچ لیجائیں اور ربانیت ہاتھ نہ آسکے — لیکن عبادت میں بھی استغراق نہ آنے دیا جائے ورنہ یہ بھی رہبانیت آفرینی کر سکتی ہے — اطاعت الٰہی کو وسیع معنوں میں برتا جائے جس میں ربط بالخلق بھی شامل ہے ورنہ وہ بھی رہبانیت آموزی کر سکتی ہے — دین کو جتا دینا چاہئے کہ زندگی اصل مقصود ہے اور عبادت و اطاعت اور معرفت و ربطیت صرف وسیلے ہیں، وسیلوں کا یہ حق نہیں ہے کہ مقصود پر چڑھا دئے جائیں اور مقصود ان کے تلے دبا جائے۔ مقصود کو بلند و بالا رہنا چاہئے اور وسائل کو اس کے پائین پڑا رہنا چاہئے ورنہ قضیہ معکوس ہو جائیگا وسیلے مقصود بن جائیں گے مقصد وسیلہ ہو جائے گا

(۵) ذہن کو ربانی اسووں سے مانوس بناؤ تاکہ علم مثال سے درست ہوتا رہے اور عمل مثال سے ترغیب پاتا رہے۔ ساتھ ہی ساتھ عبرت کے لئے انتہائی نفسانی نمونوں کو بھی پیش نظر رکھو تاکہ ذہن سمجھتا رہے کہ ربانیت سے انحراف کا پھل یہ ہوتا ہے اور اس سے عبرت پکڑتا رہے — اعلیٰ ترین اور اکمل ترین اسوہ ربانیہ، حضرت محمدیت علیہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے جس میں مجدد عالم دائرہ ربانیہ میں تمام اگلے پچھلے ربانی اسوے اسی طرح مضمر ہیں جس طرح حضرت الوہیت میں پوری کائنات مضمر ہے — پس اسی اجمع واوسع اسوہ ربانیہ کو مرکز ذہن بنانا چاہئے اور اسی پر قناعت کر لینی چاہئے کہ اسی جز میں کل موجود ہے اور اسی ایک میں سب پا جاتے ہیں۔ البتہ اس اسوہ کاملہ کو مشرح سمجھانے کے لئے دوسرے ربانی جزے بھی مشرح کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں — یاد رکھو کہ زندگی اصولوں سے صرف متخیل ہوتی ہے متشکل نہیں ہوتی متشکل عملوں سے ہوتی ہے۔ عمل اسووں اور نمونوں کے محتاج ہوتے ہیں جیسا کہ تخیل اصولوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اصول صرف ذہنی خاکے بنا ڈالتے ہیں مگر ان خاکوں میں حقیقت کا رنگ کون بھرتا ہے صرف عمل۔ عمل بغیر اسووں اور نمونوں کے چل نہیں سکتے الا وہاں جہاں اجتہاد کی شان پیدا ہے — لیکن نمونوں کو محض جان لینا ہی

کافی نہیں ہے سمجھنا بھی ضروری ہے ۔ سمجھنا فکر ربانی اور استفادہ ربانی پر منحصر ہے قوتوں کے معاملے میں ان آیات ضروریہ سے بھی غفلت مت کرو ۔ ایک اور بات بھی ہے ۔ ذہنی خاکوں پر نمونوں کو چسپاں کرنا بھی ایک اہم کام ہے ربانی فکر اور ربانی استفادہ اس اہم کام میں بھی ضروری ہیں ــــ نمونوں کے معاملے میں ایک خاص احتیاط بھی ضروری ہے وہ یہ کہ نمونوں کو حتی الوسع براہ راست سمجھنا چاہیئے اور براہ راست ماننا چاہیئے ورنہ یہ ایسا ہوگا جیسے ایک شخص کو اس کی تصویر سے پہچانا جائے بجائے اسکے کہ اسکو خود دیکھ کر پہچانا جائے ۔ تصویر اصل کی کتنی ہی سچی تصویر ہو پھر بھی سیکڑوں فرق رکھتی ہے اور کمی کی تو انتہا نہیں ۔

(۶) ذہن کو حساس اور ارتقا پذیر بناؤ ــــ اس لائق بناؤ کہ احساس کے موقعوں پر احساس کرے اور عبرت کے موقعوں پر عبرت پکڑے ۔ ذہن موم کی مانند پگھلتا رہنے والا ہو پتھر کی طرح کٹر نہ ہو ورنہ ربانیت کی جگہ شیطانیت گھر کریگی ــــ طریقہ یہ ہے کہ ذہن کو مرتکز اور مستغرق ہوجانے کی مشق کراؤ، جب کوئی بات قابل توجہ پیش آئے تو ذہن کو اس میں گاڑدو اور ڈبو دو یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ اسی کو اپنی دنیا سمجھ لے اور دنیا ومافیہا سے غافل ہوجائے تب وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ لے کر نکلے گا اور اس کو محفوظ رکھے گا ــ یہ طریقہ بھی ہے کہ اسکو قوی الاثر چیزوں کا مشاہدہ کراتے رہو، مثلاً بیابانوں صحراؤں پہاڑوں دریاؤں سمندروں ویرانوں قبرستانوں کی سیر کراتے رہو ۔ گلزاروں مرغزاروں میں بھی لے جاؤ، پھر نصیحتیں سنواؤ عبرت انگیز واقع دکھاؤ ۔ لیکن احساس وعبرت پذیری کو حد وضبط میں رکھو ورنہ توازن کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے ــ مثلاً اگر دنیا کی بے ثباتی کا رنگ گہرا جم گیا تو رہبانیت اپنا اڈا جمالیگی اگر دنیا نے گھر اگھر بنا لیا تو شیطانیت اپنا بسیرا کرلے گی اور دونوں صورتوں میں ربانیت ختم ہوجائیگی جو اعتدالیت، توازنیت اور جامعیت وکاملیت کا نام ہے ۔

(۷) ذہن کو رجائی بناؤ قنوطی نہ بناؤ ــ پرامید رکھو ناامید مت بناؤ ۔ ناامیدی ذہن کا دق ہے جو ذہن کو بالکل کھا جاتا ہے اور ذہن کے بعد زندگی کو بھی کھا جاتا ہے ــ ذہن کو یہ یقین دلاتے رہو کہ ہر ممکن کام تیرے ارادے کا بھی غلام بن سکتا ہے جیسا کہ بہتیرے بڑے انسانوں کا بنا اور ہر ممکن مقصد تیرا بھی شکار ہوسکتا ہے جیسا کہ بہتیرے بڑوں کا شکار رہا ۔

ہر ممکن چیز تیرے لئے بھی ممکن ہے اور ہر دشوار چیز تیرے لئے بھی آسان ہے ـــ البتہ لاابالی رجائی نہ بناؤ، دوسرے لفظوں میں یہ کہ شیخ چلی نہ بنا دو - کرنا کچھ نہیں اور امید سب کچھ، عمل اور امید کا توازن مفقود اور امید موجود - مبالاتی رجائی بناؤ - جہاں امید اور عمل میں تناسب ہوتا ہے - کم کام اور امید زیادہ، یہ لاابالی رجائیت ہے یہ ایسی ہی غلط اور مہلک چیز ہے جیسی قنوطیت - جتنا کام اتنی ہی امید یہ مبالاتی رجائیت ہے اور یہی رجائیت کام کی ہے کیونکہ روح افزا ہے اور حوصلہ انگیز ـــ رجائیت ہی کا ثمرہ علویت، ارتقائیت، تکمیلیت بھی ہے پس ذہن کو رجائی بنا کر علوی ارتقائی تکمیلی بھی بناؤ اور سفلی، اقتناعی تنقیصی بننے سے محفوظ رکھو ـــ ذہن کو ہمیشہ خیالات برتر کی ہوا دیتے رہو اور ان کی فضاء برتر میں بلند پروازی سکھاتے رہو، خیالات فروتر کی فروتری سے دور رکھو اور ان کی پستیوں میں ڈوبے رہنے سے بچاتے رہو - یاد رکھو کہ ذہن کی برتری زندگی کو بھی برتر بناتی ہے اور ذہن کی فروتری زندگی کو فروتر بنا دیتی ہے - ذہن کو ترقی پسند بناؤ یعنی ایسا بناؤ کہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہے اور کسی مقام اور کسی منزل پر کمر کشادہ نہ بن جائے - ذہن کو تکمیل طلب بھی بناؤ - اس میں ایسی تکمیلی بے چینی پیدا کر دو جو تکمیل سے پہلے دم نہ لینے دے - زندگی ایسے ہی ذہن کی بدولت ترقی کن اور تکمیل طلب بن سکتی ہے - ذہن کو قناعت پذیر اور تنقیص پسند نہ بننے دو ورنہ زندگی بھی ایسی ہی بن جائے گی اور ایسی زندگی، دشمن فطرت اور ضد مشیت ہے مشیت الہٰی پوری کائنات میں عموماً اور انسانوں میں خصوصاً ارتقاء و تکمیل چاہتی ہے ـــ ذہن کو علوی بنانے اور علوی رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ سفلی تخیلات سفلی تلفظات سفلی عملیات سفلی محرکات سے ذہن کو دور رکھا جائے - اسی طرح ذہن کو ارتقائی اور تکمیلی بنانے اور رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ قناعی و تنقیصی خیالات اقوال احوال اعمال محرکات سے اسکو الگ رکھا جائے ـــ

اسکا اصولی طریقہ یہ ہے کہ ذات الہٰی کو اسکے صفات و افعال کے ساتھ مرکز تصور بنا لیا جائے اور اسی تصور کے ماتحت علوی ارتقائی تکمیلی ربانی نصب العین مقرر کیا جائے پھر اسکو اپنائے اور اپنائے رہنے کی غرض سے علوی ارتقائی تکمیلی ربانی اسووں اور ربانی مثالوں کو پیش نظر رکھا جائے اسکے بعد اعلیٰ ربانی مقاصد و اغراض کا ایک مفصل خاکہ عمل بنا کر زندگی کو اسکی

تکمیل میں لگا دیا جائے ـــــ ایک ہی علوی ربانی نصب العین ہے جو پوری انسانیت میں مشترک ہے اور لازمۂ انسانیت ہے اور تمام انسانوں کے لئے یکساں فرض ہے ـ اس نصب العین کو تو یقیناً مقصد مشترک کے طور پر ہر انسان کا مقصد معین بن جانا چاہئے اور ہر انسان کو اس کے پیچھے پڑ جانا چاہئے البتہ اس کے ماتحت جزئی مقاصد و اغراض مختلف ہو سکتے ہیں ـــ یہ نصب العین کیا ہے ربوبیت عالمی بواسطہ خلافت الٰہی وحکومت ربانی کلی جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے عالم کی پرورش کی جائے حفاظت و تقویت اور ارتقاء و تکمیل کی جامع حیثیت سے اور اس کام کو انجام دیا جائے ایک ایسی عالمگیر وحدانی انسانی حکومت کے ذریعے جو اصلی ربی حکومت کی شان نہ رکھتی ہو بلکہ نیابتی حکومت کی شان رکھتی ہو اصلی حکومت صرف اللہ کے لئے ماننا چاہئے اور اس حکومت کو حکومت الٰہی کا صرف نائب اور نمائندہ ٹھہرانا چاہیئے ـ یہ حکومت خلافت الٰہی وحکومت ربانی کلی کے نام سے موسوم ہوگی خلافت اس لئے کہ خلافت نیابت کو کہتے ہیں اور یہ حکومت نیابتی حکومت ہے اصالتی حکومت نہیں ہے ـ ربانی اس لئے کہ الٰہی اور ازلی حکومت کا نمونہ ہے ـــ ذہن کو اس نصب العین کی ورزش کرانا چاہیئے اتنی ورزش کہ یہ خیال اسکی رگ رگ میں تیر جائے اور ریشے ریشے میں پیوست ہو جائے یہاں تک کہ تخیل تعشق کا درجہ اختیار کرلے ـ

عقائدیات

عمومیات

وجودیات (۱) یہ عقیدہ رکھو کہ وجود ہے اور اسکا ہونا حقیقی اور اصلی ہے ـ ایسا نہیں ہے کہ وجود نہیں یا ہے تو فرضی اور وہمی ہے ـ وجود اگر نہیں ہے تو تم کون ہو جو حکم لگاتے ہو کہ وجود نہیں ہے اور وجود اگر فرضی و وہمی ہے تو تمہارا یہ حکم کہ وجود فرضی اور وہمی ہے کیا حیثیت رکھتا ہے ـ سچ یہ ہے کہ وجود [illegible] ـ یا وجود کو فرضی اور وہمی بتانا ہی ایک وہم ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوا کہ تم وجود کا احاطہ نہ کر سکے اس کے آغاز اور انجام کو تصور کی گرفت میں نہ لاسکے اس کی

حقیقت اور اصلیت کو نہ سمجھ سکے اسکی گوناگونی در گوناگونی اور پیچیدگی در پیچیدگی کو دیکھ کر اتنے مبہوت و مخبوط ہو گئے کہ وجود کا جس کا ایک مصداق تم بھی ہو انکار کر بیٹھے حالانکہ تم نے یہ نہیں سوچا کہ یہ انکار اقرار بھی ہوا کیونکہ انکار بھی وجود ہی کا کام ہے۔ منکر وجود نہیں تو انکار کون کر رہا ہے پھر انکار بھی تو ایک وجود ہے کیونکہ انکار ایک تصور ہے ایک الفاظ ہے تصور اور تلفظ بھی ایک وجود ہے ـــــ پس اس وہم سے نکلو اور یہ سمجھ کر کہ وجود کا انکار ناممکن ہے وجود کا اقرار کرو۔ اگلوں نے منکرین وجود کے انکار وجود کا علاج یہ سوچا تھا کہ انھیں آگ میں ڈال دیا جائے تب وہ لا محالہ انکار وجود سے توبہ کریں گے مگر یہ علاج علمی علاج نہیں ہے یہاں جو دلیل پیش کی گئی ہے علمی علاج ہے اور بالکل کافی علاج ہے۔

(۲) وجود کو ایک مانو۔ اس لئے ایک مانو کہ چند ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے پھر چند ماننا بھی ایک ماننے ہی پر ختم ہوگا کیونکہ ہر چند چیزوں میں ایک مشترک چیز نکالنا پڑتی ہے چند وجودوں میں مشترک چیز کیا نکلے گی وہی وجود ـــ پس وجود لا محالہ ایک ہی ہے۔

(۳) البتہ وجود کی قسمیں اور شکلیں چند ہو سکتی ہیں اور ہیں اور یہ چند بہت ہیں اور بہت بھی محدود نہیں نامحدود،

(۴) وجود خود بخود ہے کسی کے موجود کرنے سے نہیں ہے نہ ایسا ہونا ممکن ہے وجود کو کون موجود کرے گا، کیا عدم؟ عدم بیچارہ خود موجود نہیں دوسرے کو کیا موجود کرے گا، پھر کیا وجود؟ اگر یہ کہئے تو اس کا نتیجہ کیا؟ یہی تو کہ وجود خود بخود موجود ہے کیونکہ اسی نے اپنے کو موجود کیا، ایک چیز نے خود اپنے کو موجود کیا یا وہ خود بخود موجود ہے ان دونوں عبارتوں کا مطلب تو ایک ہی ہے پھر عبارتی پھیر پھار اور چکر سے فائدہ؟

(۵) وجود کبھی مٹ نہیں سکتا؟ وجود کے سوا اور کوئی چیز ہے کہاں جو اسکو مٹائے پس وجود کو امٹ مانو اور مستقل اور دائمی تصور کرو ـــ اور یہ جو تم کسی موجود کو مٹتے ہوئے دیکھتے ہو تو وہ وجود کا مٹنا نہیں ہے کسی ایک خاص موجود کا مٹنا ہے۔ کوئی ایک موجود کیا چیز ہے وجود کی ایک خاص شکل ہے۔ . . وجود کی کسی خاص شکل کا مٹنا وجود کا مٹنا نہیں ہے۔ پھر دیکھو کہ جب ایک موجود مٹتا ہے کوئی دوسرا موجود بن جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وجود کی ایک خاص شکل

یوں ہی مٹتی ہے کہ کوئی دوسری شکل اس کی جگہ لے لیتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ وجود
کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے اور مستقل اور دائمی چیز ہے۔

(۶) وجود کو تغیر پذیر یا دوسرے لفظوں میں حرکت پذیر مانو اسلئے کہ وجود کی بہتیری شکلیں مٹتی
رہتی ہیں اور اس طرح مٹتی رہتی ہیں کہ اپنی جگہ دوسری شکلوں کو قائم کرتی رہتی ہیں۔ یہ تغیر اور
تحرک وجود کا نقص نہیں ہے وجود کا کمال ہے کیونکہ وہ قدرت کی دلیل ہے انجماد عجز ہے
انتقال قدرت ہے سکون عجز ہے حرکت قدرت ہے پس وجود تغیر پذیری کے سبب
ناقص نہیں ہے کامل ہے۔

(۷) وجود ذی حیات ہے بے حیات نہیں ہے، زندگی رکھتا ہے بے زندگی نہیں ہے
اس لئے کہ متحرک ہے ساکن نہیں ہے منتقل ہے منجمد نہیں ہے بے قرار ہے قرار دار نہیں
ہے۔ حرکت، انتقالیت، بے قراری ہی زندگی ہے۔ پس وجود کو ذی حیات مانو بے حیات
نہ مانو۔

(۸) وجود کو ارتقائی مانو التوائی نہ مانو۔ وجود کی حرکت آرائی بے سبب نہیں ہے باسبب
ہے بے غرض نہیں ہے باغرض ہے بے نتیجہ نہیں ہے بانتیجہ ہے، کیا ہے وہ سبب ارتقا
کا جذبہ ہے۔ کیا ہے وہ غرض ارتقا میں انہماک۔ کیا ہے وہ نتیجہ، ارتقا کا تسلسل۔ اگر وجود کی حرکت
بے ارتقا ہے تو حرکت فضولی ہے اصولی نہیں ہے۔ مشاہدہ بھی اس دعوی کی تصدیق
کرتا ہے۔ دنیا ترقی پذیر ہے، دنیا کیا ہے؟ وجود۔ پھر جہاں حرکت ہے وہاں التوا کہاں، حرکت
صرف ارتقا کے لئے ہوتی ہے التوا کے لئے نہیں ہوتی بلکہ حرکت خود ارتقا ہے پس جہاں
حرکت ہے وہاں التوا نہیں ہے۔ پس وجود ارتقائی ہے التوائی نہیں ہے — مگر وجود
کا ارتقا التقائی ہے لا التقائی نہیں ہے دوری ہے طولی نہیں ہے داخلی ہے خارجی
نہیں ہے اظہاری ہے اور وجود اظہاری ہے اتخاذی نہیں ہے۔ وجود کا ارتقا بے منزل
اور بے لقا نہیں ہے اس کے لئے منزل ہے اور اس منزل کی ملاقات ہے، مگر اسکی
منزل باہر نہیں ہے اندر ہے اس کی منزل اس کا باطن ہے اس کا ظاہر مرتقی ہے اور
اس کا باطن مرتقی الیہ، اس کا ظاہر چل رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ کس کی طرف اپنے باطن

کی طرف وہ اپنے باطن تک پہونچنا چاہتا ہے اور پہونچتا ہے، مگر اس کا باطن نامحدود ہے، مگر مختلف المراحل نامحدود، پس وہ باطن کے آخر تک کبھی نہیں پہونچ سکتا جہاں وہ ہمیشہ کے لئے دم لے لے جہاں اسکی حرکت اور ارتقائیت ہمیشہ کے لئے رک جائے اسلئے اس کا ارتقا مسلسل ہے دوامی ہے مگر درمیانی التقاؤں اور ملاقاتوں کے ساتھ مسلسل ہے، وہ اپنے باطن کے مختلف مرحلوں سے ملتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور چونکہ مرحلے لامتناہی ہیں اور چونکہ باطن لامتناہی ہے اس لئے اس کا ارتقا بھی لامتناہی ہے۔ مشہور ڈاروِن نظریۂ ارتقا کا جدید داعی اعظم ارتقا کا ناقص عارف تھا اسلئے ارتقا کی اس کمالی صورت کو نہیں سمجھ سکا اور ارتقا کی ناقص صورت تراش بیٹھا، اس کا ارتقا ارتقائے لاالتقائی رہ گیا، ارتقا التقائی نہ بن سکا — ڈاروِن نے لاالتقائی ارتقا کو رد کر دیا اور دین کے التقائی ارتقا کو گلے لگاؤ۔ ڈاروِن ارتقائی ارتقا سے اسی لئے جاہل رہا کہ اس نے علم دین سے مدد نہیں لی اور دین سے بہرہ اندوزی نہیں کی — وجود کا ارتقا وجود ہی کے گرد چکر لگانے والا اور اسی کے دائرے میں گھومنے والا ہے۔ وجود کے علاوہ اور وجود کے باہر کوئی دوسری چیز ہے کہاں جس کے لئے اور جس کی طرف وجود چلے گا اور بڑھے گا — وجود کا ارتقا اپنے اندر ہی کے لئے ہے اپنے باہر کے لئے نہیں ہے۔ وجود کا ارتقا اپنے آپ ہی کو ظاہر کرنے کے واسطے ہے اور اس کے ارتقا میں یہی ہوتا رہتا ہے، اس کا ارتقا دوسرے سے کچھ اخذ کرنے کے لئے نہیں ہے نہ ایسا ہوتا ہے دوسرا ہے کہاں کہ اس سے اخذ کیا جائے وہ خود ہی ہے اور ارتقا کے ذریعے خود ہی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

(۹) وجود کو ذی شعور مانو۔ وجود کو بے شعور ماننا سخت بے شعوری ہے شعور ہے کیا چیز؟ وجود ہی تو ہے اسکے سوا کوئی اور چیز، پس وہ وجود سے باہر کہاں جا سکتا ہے؟ پھر حرکت شعور ہی کا تو نتیجہ ہے بے شعور حرکت ہو کیسے سکتی ہے محرک حرکت کو سمجھتا ہے تب ہی تو حرکت کو پیدا کرتا ہے یا حرکت کو قبول کرتا ہے، پس جہاں حرکت ہے وہاں شعور پھر وجود میں حرکت ہے پس وجود باشعور ہے — پھر جہاں تم شعور کو مانتے ہو وہاں شعور کہاں سے

آپ نے کسی وجود ہی سے تو پھر جہاں شعور کو مانتے ہو وہاں بھی تو وجود ہی ہے، تب وجود ہی
مخزن شعور نکلا۔ پھر اسکے کیا معنی کہ وجود میں ایک جگہ شعور دوسری جگہ بے شعوری، اگر شعور
وجود ہی کا خاصہ ہے اور وجود ہی کا تقاضہ ہے تو جہاں وجود ہے وہاں شعور ہے اور وجود
کہاں نہیں ہے؟ اور وجود کے سوا دوسرا کون ہے پس شعور ہر جگہ ہے۔ تب وجود بدرجۂ مطلق
ذی شعور ہے نہ بہ صورت مقید۔

(۱۰) وجود کو کامل مانو۔ ہر کمال کوئی بھی ہو وجود ہی تو ہے تب ہر کمال وجود ہی میں ہے
وجود ہی سے ہے وجود ہی کے لئے ہے تب وجود یقیناً کامل ہے۔ نقص کیا ہے؟ عدم؟
عدم وجود میں کہاں گھس سکتا ہے؟ پس وجود نقص سے پاک ہے اور بالکل کامل ہے
وجود خیر محض ہے عدم شر محض۔ ہونا ہی خیر ہے نہ ہونا ہی شر ہے۔

وجود کی بے شمار قسمیں ہیں اور بے حساب شکلیں۔ اختلاف اور کثرت انھیں شکلوں میں
ہے اور قسموں میں۔ اور یہیں سے وجود کی کثرت کا دھوکا ہوتا ہے اور بہتیرے سمجھ بیٹھے ہیں
ہیں کہ وجود کثیر ہیں حالانکہ وجود ایک ہی ہے اگر ایک انسان شکلیں بہتیری بناتا رہتا ہے
تو اس کی انسانیت تو ایک ہی رہے گی اور ایک ہی مانی جائے گی صرف شکلیں کثیر ہو جائیں
گی اور صرف شکلوں کو کثیر مانا جائے گا ــــ وجود ہی کی ایک شکل اللہ ہے اور وجود ہی کی ایک
شکل انسان ہے۔ وجود کی کلی شکل اللہ ہے جس میں وجود کی تمام شکلیں تخمی صورت میں
مضمر ہیں اور جس سے ہی وجود کی تمام شکلیں شجری صورت میں نکل پڑتی ہیں اور سلسلہ
وجودات اور کائنات بن جاتی ہیں پھر اسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور اسی میں گم ہو جاتی
ہیں اور اسی طرح لا انتہا ہی تسلسل ہے۔

منہ المبدء والیہ المآب۔ انسان ایک جزئی شکل اور اسی کلی شکل اللہ سے نکلا ہوا ہے
اور وہ بھی اسی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اسی میں گم ہو جاتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون
عدمیات۔ عدم کوئی مستقل چیز نہیں ہے وجود کا انتقال ایک صورت سے دوسری
صورت کیطرف ہی عدم کہلاتا ہے۔ پھر خارجی چیز نہیں ہے۔ صرف ذہنی چیز ہے پھر
حقیقی چیز نہیں ہے صرف اعتباری چیز ہے ــــ عدم موجود نہیں ہے صرف مفہوم ہے۔

پس اصل چیز صرف وجود ہے۔ عدم وجود پر طاری نہیں ہوتا، عدم کوئی چیز ہو تو کسی چیز پر طاری ہو۔ صرف سمجھ لیا جاتا ہے اور فرض کر لیا جاتا ہے۔ وجود کی کسی صورت کا تسلسل جب حد کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا نام عدم رکھ دیا جاتا ہے۔ پس عدم کو قابلِ توجہ نہ بناؤ، صرف وجود کو قابلِ توجہ بناؤ۔ عدم سے ڈرو مت نہ اور کسی طرح کا اثر لو۔ موت عدم نہیں ہے وجود ہے، وجود کا انتقال ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف۔

امکانیات | امکان بھی عدم کی طرح محض ذہنی اور اعتباری چیز ہے۔ ایک چیز کا ہو سکنا امکان کہلاتا ہے۔ ہو سکنا خیالی اور اعتباری مفہوم ہے خارجی وجود نہیں رکھتا۔ موجود خارجی صرف وجود ہے اور بس۔ امکان کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہونا اور رہنا ضروری نہ ہو۔ امکان اس معنی میں بھی اعتباری اور خیالی چیز ہے۔ پس عدم کی طرح امکان بھی لائق اعتنا نہیں ہے، لائق اعتنا صرف وجود ہے۔ امکان کی دو ضدیں ہیں، ایک استحالہ دوسرا وجوب۔ استحالہ نہ ہو سکنا ہے وجوب ضروری الوجود ہونا ہے۔ یہ دونوں بھی اعتباری اور خیالی چیزیں ہیں حقیقی چیز صرف وجود ہے۔

زمان اور مکان عمومیات میں نہیں ہیں، وہ موجود ہی کی شکلیں ہیں اور بس۔

الہیات

ذاتیاتِ الٰہی | (۱) حضرت الوہیت (اللہ) وجود ہی کی ایک شکل ہے مگر کلی شکل۔ وہ شکل جو عین وجود ہی کہی جا سکتی ہے وہ شکل جو وجود کی تمام شکلوں کا مخزن و معدن ہے مبدء و مصدر ہے ملجا و مخرج ہے۔ اسی میں وجود کی سب شکلیں رہتی ہیں تخمینی صورت میں یعنی دبی دبائی ناکشودہ اور ناشگفتہ پھر اسی میں سے نکلتی ہیں تشجری صورت میں کشودہ اور شگفتہ۔ وجود کی یہ شکل کلی شکل ہے۔ باقی ... ی شکلیں اسی کلی شکل میں سے نکلتی رہتی ہیں اور جا رہی ہیں

کو پیدا کر کے اسی میں سماتی رہتی ہیں۔ اس کی ناقص مثال ایک سمندر کی سی ہے جس
میں ہی پانی کی تمام شکلیں بستی رہیں جس میں ہی سے پانی کی تمام شکلیں نکلتی ہیں پھر
اسی میں سما جاتی ہیں ـــ اسی لیے اس کو خالق کہتے ہیں۔ باقی کو مخلوق جس سے دھوکا ہوتا
ہے کہ کائنات الگ چیز ہے۔ ذات الٰہی الگ چیز۔ حالانکہ دونوں چیزیں حقیقتاً ایک ہی
ہیں صرف اعتباراً الگ چیزیں ہیں، اور اعتبار کا کیا اعتبار۔ مخلوقات اس معنے میں
مخلوقات نہیں ہیں کہ ذات الٰہی سے الگ ہیں، الگ رہتی ہیں، الگ بنتی ہیں، الگ
مٹتی ہیں، نہ ذات الٰہی اس معنے میں خالق ہے کہ وہ دوسروں سے الگ ہے، الگ ہستی
ہے الگ کرتی دھرتی ہے۔ الگ بناتی ہے الگ بگاڑتی ہے۔ اگر ایسا مانا جائے تب تو یہ
ماننا پڑے گا کہ وجود مستقل طور پر چند ہیں، حقیقت میں چند ہیں اور بہت ہیں اور بیشمار
و بے حساب ہیں حالانکہ وجود ایک ہے، ایک ہی ہو سکتا ہے، وجود میں دوئی کہاں، چندگی
کہاں بے شماری کہاں؟ ـــ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ عدم میں تھیں اور اشارہ الٰہی سے وجود
میں آگئیں۔ عدم کوئی چیز ہو تب اس میں کوئی چیز مقیم ہو اور تب اس میں سے کوئی
چیز نکلے ـــ اگر یہ کہو کہ ہم عبارت بدل کر یوں کہیں گے کہ مخلوقات نہ تھیں حکم الٰہی، اور
تصرف الٰہی سے ہو گئیں تب بھی بحث ختم نہیں ہوتی، حقیقت عبارت میں دبا دینے سے
حقیقتاً نہیں دب جاتی اور غائب نہیں ہو جاتی ـــ نہ تھیں کا کیا مطلب؟ یہی نہ کہ عدم میں
تھیں یا معدوم تھیں، اچھا یہی سہی کہ معدوم تھیں، اول تو یہ کلام ہی غلط ہے، تھیں بھی
اور معدوم بھی یعنی غیر موجود بھی۔ متناقض باتیں؟ تھیں وجود کی خبر دیتا ہے پس موجود
بھی معدوم بھی؟ پھر معدوم موجود کیسے بنا؟ اسی طرح نہ کہ وجود کو قبول کیا ـــ یہ نقیض
کس قدر غلط ہے، کہیں ایک نقیض دوسری نقیض کو قبول کر سکتی ہے؟ یہی تو اجتماع
نقیضین ہے جو مسلم طور پر محال ہے۔

کہو گے کہ جب عدم اٹھ گیا تب وجود آیا، اجتماع نقیضین کہاں؟ لیکن اس کا
کیا مطلب؟ آیا یہ کہ عدم اٹھ گیا اور وہ چیز رہ گئی؟ اگر یہ؟ تب تو وہ پہلے سے موجود
ہے۔ پھر عدم سے وجود میں آنا کیا معنی؟ پھر عدم تھا اور اٹھ گیا یہ تو بتاتا ہے کہ عدم

بھی وجود رکھتا ہے حالانکہ عدم وجود کا ضد ہے ــــ غرض کہ عدم سے مخلوقات کا وجود میں آنا غلط، مخلوقات کی خالق سے علیحدگی غلط۔ صحیح یہ اور صرف یہ کہ مخلوقات خالق کے اندر اور از روئے حقیقت عین خالق اور اسی کے اندر سے باہر اور باہر بھی اس معنی میں باہر نہیں کہ اس سے الگ بلکہ اسی میں مگر ظہور و نمود کے ساتھ اسی میں۔ خلقت سے پہلے اس کے اندر خفا و کمون کی شان میں۔ خلقت کے بعد بھی اسی کے اندر ظہور و نمود کے مرتبے میں۔

(۲)۔ حضرت الوہیت کو بھی مانو جیسا کہ خلق الہٰی کو مانتے ہو، اور اللہ کے نام سے مانو، اس لئے کہ اس نے اپنے لئے اسی نام کو چنا۔ خلق اللہ کو ماننا اور اللہ کو نہ ماننا جہالت ہے، ضلالت ہے، شرارت ہے، ہلاکت ہے۔ وجود کی جزئی شکلوں کو ماننا کلی شکل کو نہ ماننا جہالت نہیں تو کیا ہے؟ ناقص شکلوں کو ماننا کامل شکل کو نہ ماننا ضلالت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ فروع کو ماننا اور اصل کو نہ ماننا شرارت ہی ہو سکتی ہے۔ خیرات جزئیہ کو ماننا اور منبع خیر کو نہ ماننا ضلالت ہی ضلالت نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳)۔ حضرت الوہیت کو صرف اس طرح نہ مانو کہ ایک ضرورت ہے بلکہ اس طرح بھی مانو کہ حقیقت ہے اور ایسی حقیقت کہ ہر حقیقت اس کے مقابلے میں بے حقیقت ہے اور ایسی حقیقت کہ بحث و دلیل کی طرف سے بے حاجت ہے کیونکہ مجسمۂ ہدایت ہے اور عین الفطرت ہے۔

---

(۱)۔ اللہ کو ماننا اور منوانا بلا غرض بھی ہے، کیونکہ یہ علم کا تقاضہ ہے حقیقت کا مطالبہ ہے اور با غرض بھی ہے اس لئے کہ انسان جو خود مختار اور با اختیار ہے۔ خود مختاری اور با اختیاری کے سبب اپنی حقیقت کی اختیاری شکل اور اپنی زندگی کے اختیاری تعین کے لئے ایک معیار ایک نمونے کا محتاج ہے جو کامل ہو اور ہادی فی حاکم بھی ہو تاکہ اپنی استطاعت کی حدِ آخری کے اندر اس کے تشبہ و ہمرنگی کے ذریعے خود کو صحیح اور کامل بنا سکے اور اس کو اپنے اختیار سے کامل بننے میں اس کی حاکمانہ ہدایت سے مدد بھی مل سکے

پھر خود حسبِ حیثیت کامل بنکر اس کی خلافت بھی حاصل کر سکے۔ تاکہ اس کی زندگی اور اس کی کاملیّت اسی کے لیے نہ ہو، باقی تمام موجودات کے لیے ہو۔ وہ اپنی زندگی اور کاملیت کو باقی موجودات کی خدمت میں یعنی اعانت فی الارتقائیت میں استعمال کر سکے اور اس طرح اپنے ظہور کو بامعنے بنا سکے ـــــ پس حضرتِ الوہیت (اللہ تبارک و تعالیٰ) کو بالغرض بھی مانو جیسا کہ بلاغرض مانو اور غرض مشابہت و خلافت رکھو۔

(۲) حضرتِ الوہیت کو ربّ الخلق کی حیثیت سے بھی مانو۔ جیسا کہ اصل الخلق اور خالق الخلق کی حیثیت سے مانو۔ اگر خالق الخلق کی حیثیت سے مانا اور ربّ الخلق کی حیثیت سے نہ مانا تو حضرتِ الوہیت کو ادھورا مانا پورا نہیں مانا، ناقص الربط مانا کامل الربط نہیں مانا۔ کامل الربطی خالقیت سے نہیں ہے ربّیت سے ہے۔ خالقیت آنی چیز ہے دوامی چیز نہیں ہے۔ محمودیت بھی ربّیت سے وابستہ ہے، خالقیت سے نہیں ہے۔ خالقیت کا ثمرہ ممدوحیت ہے نہ کہ محمودیت۔ پڑھو۔ اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ ط ـــ ـــــ ربّیت بھی دو قسم ہے ربّیت کلّی اور ربّیت جزئی جیسا کہ ربّیت ذاتیاتی اور ربّیت ماسوائیاتی۔ ربّیت الٰہی کو ربّیت کُلّی ماسوائیاتی مانو اور ربّ العالمینی کی شان سے مانو۔ ـــــ اور یہ مان کر خود ربّیت پیدا کرو۔ یعنی ظلّی ربّیت پیدا کرو۔ اور اپنی ربّیت کو بھی اپنی استطاعت امکانی کی حد تک ربّیت کُلّی ماسوائیاتی بناؤ۔ یعنے ربّیت عالمینی بناؤ۔ اور اس طور سے محمودیت و خلافت کا مقام حاصل کر لو اور خلیفۃ اللہ بنکر بسر کرو۔ یہی تمہاری معراجِ کمال ہے، یہی ہر انسان کی معراجِ کمال ہے۔ اے کاش ہر انسان اس نکتۂ معرفت کو سمجھ سکتا ـــ اگر اس معاملے میں انسانی مثال کی ضرورت ہے، اور یقیناً ہے کیونکہ جبلّی مثال قریب الفہم اور قوی الاثر ہوتی ہے تو حضرتِ محمدیّت کو سامنے رکھو جس نے اپنی ربّیت کو ظلّی ربّ العالمینی بنا کر رحمۃ للعالمینی کی شان حاصل کی اور خلیفۃ اللہ اعظم کا مرتبہ سمیٹا۔ فصلّے اللہ علیہ صلوٰتنا کاملاً دائماً و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ و اتباعہٖ۔

---

(۴) حضرتِ الوہیت کو بحیثیت مالک و حاکم کے بھی تسلیم کرو۔ مالکیت و حاکمیت

کو بھی ربوبیت کی طرح مالکیت و حاکمیت کُلّیۂ عالمیہ کے رنگ میں تسلیم کرو۔ پھر یہ بھی تسلیم کرو کہ اس کی مالکیت و حاکمیت ملوکیت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ جس کی غرض تفاخر و تکاثر، تکبیر و تحقیر، تمتّع و تعیش ہوتی ہے۔ بلکہ ربوبیت کی بنیاد پر ہے۔ جس کا مقصد افادہ و افاضہ ہوتا ہے۔ یعنے دوسروں کو فائدہ پہنچانا اور فیض بخشی کرنا۔ دوسرے لفظوں میں یہ مانو کہ اس کی مالکیت و حاکمیت، ربّانی مالکیت و حاکمیت ہے، نفسانی مالکیت و حاکمیت نہیں ہے۔

اس تسلیم کی ایک غرض اور منفعت یہ ہے کہ ربّیت الٰہی کی تاثیر میں اعتدال و توازن پیدا ہو جائے گا۔ سمجھ گے کہ حضرتِ اُلوہیت ربّ و رحیم ہی نہیں ہے جس سے ربوبیت و رحمت اُترتی رہتی ہے۔ مالک و حاکم بھی ہے، جس سے محاسبہ و مواخذہ بھی صادر ہوتا رہتا ہے اور یہ سمجھ کر بے پروائی اور نافرمانی کی گمراہی سے بچ سکو گے، ضابطۂ الٰہی کے ماتحت زندگی کو چلا سکو گے۔ دوسری غرض اور منفعت یہ ہے کہ خود اپنے اندر ہی ظلّی مالکیت و حاکمیت کی شان پیدا کر سکو گے۔ جو ظلّی ربیت کے ساتھ ساتھ خلیفۃ اللّٰہیت کا منصب چلانے کے لئے ضروری ہے۔ مگر تمہاری مالکیت و حاکمیت کو بھی ربّانی مالکیت و حاکمیت ہونا چاہیئے۔ نفسانی مالکیت و حاکمیت نہ ہونا چاہیئے۔ اور استطاعت امکانی کی حد تک مالکیت و حاکمیتِ کلّیہ ہونا چاہیئے۔

(۵)۔ حضرتِ اُلوہیت کو قادر و مختارِ کل کی حیثیت سے بھی مانو۔ اور خود کو بھی ظلّی قادر و مختارِ کل بنانے کا منصوبہ باندھو تاکہ منصبِ خلیفۃ اللّٰہیت کو بخوبی چلا سکو۔

(۶)۔ حضرتِ اُلوہیت کو عالمِ کل اور فاعلِ کلّی کی حیثیت سے بھی مانو۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور سب کچھ کرتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ تمہارے علم اور فعل کو چھین لیتا ہے۔ اور تمہیں جاہل اور معطّل بنا دیتا ہے۔ بلکہ اس طرح کہ تمہیں تمہارے دائرے میں علم اور فعل کے لئے مختار رکھتا ہے۔ جو کچھ چاہو جانو اور جو کچھ چاہو کرو۔ البتہ تمہاری ہدایت کے لئے اپنے علم و فعل کا نقشہ بھی تم پر روشن فرما دیتا ہے اور اپنی یہ خواہش جتا دیتا ہے کہ تمہارا علم اس کے علم سے اور تمہارا فعل اس کے فعل سے

مخالف ہونے نہ پائے تاکہ تمہارا علم جہل نہ بن جائے اور تمہارا فعل گمراہی نہ ہو جائے ــــ پس تم یہ کرو کہ اس کو عالم کُل اور فاعلِ کُلّی مان کر اور اس کے علم و فعل کا نقشہ معلوم کر کے جو اس کے الہامیات سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اپنے علم و فعل کو اس کے علم و فعل کے ماتحت کر دو ــــ یہ بھی مانو کہ وہ اپنے علم و فعل کے ذریعے تمہارا ہادی بھی ہے، تمہیں ہدایت بھی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح کہ تم میں سے ان برگزیدوں کو جو اس کے علم و فعل کا نقشہ معلوم کر لینے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ الہام کے ذریعے اپنے علم و فعل کے نقشے سے آگاہ فرماتا رہتا ہے اور حکم دیتا رہتا ہے کہ وہ اس نقشے پر خود چلیں اور چل کر جیسی مثال و معیار قائم کریں پھر دوسروں کو چلائیں ــ اس الہامی تعلیم کے ذریعے ایک کتاب تیار ہو جاتی ہے جس سے جب چاہو علم و فعل الٰہی کا نقشہ معلوم کر لو۔ حضرتِ اُلوہیت کو ہادی مان کر تم بھی ظلّی ہادی بن جاؤ ــــ حضرتِ اُلوہیت کے علم و فعل کا نقشہ ہی صراطِ مستقیم کہلاتا ہے۔

(۷) حضرتِ اُلوہیت کو معبود و مستعان کی حیثیت سے بھی مانو۔ یعنے یہ کہ وہ عبادت اور استعانت کے لائق ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس سے استعانت چاہی جائے۔ اس کو پوجا جائے۔ اور اس سے مدد مانگی جائے یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ تمہاری روح یوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔ یوں ہی اس سے تقرّب کر سکتی ہے، یوں ہی اس سے مستفیض بن سکتی ہے ــــ حضرتِ اُلوہیت کو معبود و مُستعان مان کر عبادت و استعانت کو خود پر لازم کر لو تاکہ اس سے تقرّب پا سکو، اس کا تشبّہ حاصل کر سکو، عملی خلیفۃ اللہ بن سکو ــــ اگر حضرتِ اُلوہیت کو معبود و مستعان مان کر اس کی عبادت اور اس سے استعانت کیا کرو، تو تم بھی ظلّی معبود و مستعان بن جاؤ گے۔ یعنے محبوب و مرجع بن رہو گے۔ تم صراط مستقیم پر چل سکو گے اور مُنعَم و مکرّم بن سکو گے۔ مغضوب و ضالّ ہونے سے محفوظ رہ سکو گے ــ فضلِ ربّی تمہاری مدد فرمائے ــــ

حضرتِ الوہیت کو ایک ہی مانو۔ جس طرح "دو سلطان در اقلیمے نہ گنجند" دو اللہ در کائنات نہ گنجند۔ وجودِ کلی ہی کا نام اللہ ہے۔ وجودِ کلی دو ہو ہی نہیں سکتے۔ ذاتاً ہی توحید نہ مانو صفاتاً بھی توحید مانو، حضرتِ الوہیت ذات ہی میں ایک نہیں ہے صفات میں بھی ایک ہے۔ اس کی صفات دوسروں میں ظلی ہیں اصلی نہیں ہیں۔

صفاتیاتِ الٰہی

(۱)۔ حضرتِ الوہیت کی صفات جنہیں صفاتِ الٰہی کہا جاتا ہے، بہت ہیں مگر اُمُّ الصفات تین ہیں۔ حیات، علم، قدرت۔ قدرت دو شاخ رکھتی ہے، ربوبیتی قدرت، اہلاکی قدرت۔ یہ تینوں صفتیں عالمِ ملکوت میں جو ملائکہ کی دنیا ہے اپنے یہ تین ملکی مظہرِ اول رکھتی ہیں، جبرئیل میکائیل، اسرافیل، جن کو سنسکرت زبان میں برہما، وشنو، مہیش کہا گیا ہے۔ جبرئیل جامع مظہر ہے، وہ تینوں صفتوں کا مظہرِ کامل ہے۔ اس لئے تینوں ملکوں میں سردارِ اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کا خصوصی تعلق صرف حیات اور علم کی دو صفتوں سے ہے۔ میکائیل ربوبیتی قدرت کا خاص مظہر ہے۔ اسرافیل ہلاکتی قدرت کا خاص مظہر ہے۔ عزرائیل جو موت کا فرشتہ ہے اسرافیل کا کارندہ ہے۔ عالمِ جبروت میں جو روحوں کی دنیا ہے یہ صفتیں اپنے یہ تین روحی مظہرِ اول رکھتی ہیں۔ روحِ محمدیؐ، روحِ نوحی روحِ عیسوی۔ روحِ محمدیؐ جامع مظہر ہے اور اس لئے تینوں روحوں کی سردار ہے۔ روحِ نوحی قدرتِ اہلاکی کا مظہر ہے۔ روحِ عیسوی قدرتِ ربوبیتی کا مظہر ہے۔ روحِ محمدیؐ کا مظہرِ ملکوتی جبرئیلؑ ہیں۔ مظہرِ ناسوتی اولی آدمؑ ہیں، مظہرِ ناسوتی آخری محمدؐ ہیں۔ روحِ نوحی کا مظہرِ ملکوتی اسرافیلؑ ہیں، مظہرِ ناسوتی نوحؑ ہیں۔ روحِ عیسوی کا مظہرِ ملکوتی میکائیلؑ ہیں، مظہرِ ناسوتی عیسیٰؑ ہیں۔ روحِ محمدیؐ کے جو ناسوتی مظاہر بتائے گئے ہیں وہ کلی مظاہر ہیں۔ ان کے علاوہ وہ جزئی مظاہر بھی رکھتی ہے۔ اسکے ناسوتی جزئی مظاہر ورقہ، خدیجہؓ عائشہؓ، فاطمہؓ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، حسنینؓ، بلالؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ، اویسؓ، عشرہ مبشرہؓ اصحابِ صفہؓ، اصحابِ بدرؓ ہیں۔ دورِ اول میں اور ان جزئی مظاہر میں کلیت کا درجہ فاطمہؓ و عائشہؓ، ابوبکرؓ و عمرؓ، ابوذرؓ و حسینؓ کو ہے۔ کلیتِ ابتدائی کا درجہ فاطمہؓ و عائشہؓ، ابوبکرؓ و عمرؓ

کو کلیت درمیانی کا درجہ ابوذر کو، کلیت آخری کا درجہ حسین کو۔ درمیانی دوروں میں ہر صدی کا مجدد اور ہر الف کا مجدد ہے۔ دورۂ آخرہ میں ناسوتی مظہرِ کلی مہدی آخرالزماں ہیں جو عیسیٰ سے اقتدا کراکے جو کلمۃ اللہ اور روح الٰہی ہیں اور تمام نبوتوں کا دسوا نبوتِ محمدی کے خلاصہ ہیں تمام نبوتوں کو اپنے اندر سمیٹ کر نبوتِ جامعہ کی طرف سے ہدایت کا کاروبار پھیلائیں گے اور ہدایت اور انسانیت کی تکمیل کرینگے۔ اُس وقت قیامت آجائیگی جو انسانیت کے دورۂ اولیہ ناسوتیہ کی تکمیل اور دورۂ ثانیۂ ملکوتیہ کے آغاز کا نام ہے جس میں انسانیت ناسوتیت سے ملکوتیت کی طرف منتقل ہوگی۔ اور انسان ناسوتی انسان سے ملکی انسان بن جائے گا۔ جس کو علوی انسان کا بھی لقب دیا گیا ہے۔ جس کے لئے پُرزور علمی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ جس کی زبردست خواہش فطرتِ انسانی میں ودیعت پائی جاتی ہے۔

پس صفات الٰہی پر عموماً اور اُمّ الصفات الٰہی پر خصوصاً ایمان لاؤ۔ ان سے رابطہ قائم کرو، ان کی تجلیات کو اپنے اندر منعکس کرو، اس حد تک منعکس کرو کہ اپنی صفات کو ان کے رنگ میں ڈبو دو۔ یہاں تک کہ تمہاری صفات ظلّی صفات الٰہی بن جائیں اور تم خلیفۃ اللہ ہو جاؤ۔

اُمّ الصفاتِ الٰہی کا مظہرِ جامع روح کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ اور روح کلی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی کا نام علم روحانیت میں روحِ محمدی ہے، فلسفۂ عامہ میں عقلِ اول ہے الہامی زبان میں لوحِ محفوظ ہے۔

یہی روحِ کلی ارواحِ جزئی میں شاخ در شاخ بٹتی ہوئی، پوری کائنات میں پھیلی ہوئی اور حضرتِ الوہیت کا خلیفۃ اللہ کلی بنکر پوری کائنات پر حکومت کرتی ہوئی ہے۔

یہی روح، علمی زبانِ خصوصی میں رُوح الامین اور روح القدس بھی کہی گئی۔

صفاتِ الٰہی اپنی مستقل دنیائیں رکھتی ہیں۔ ہر صفت الٰہی اپنی ایک مستقل دنیا رکھتی ہے۔ یہی صفات ہیں جو مخلوقاتی کائنات اور کائناتِ ذات میں رابطۂ اتصال

پیدا کرتی ہیں اور نقطۂ اتصال بنتی ہیں۔ صفات ہی کے ذریعے ذات کائنات مخلوقات کی طرف متوجہ ہے۔ اور کائناتِ مخلوقات ذات کی طرف راجع اور اس سے مستفید ہے ___ صفاتِ الٰہی سے مخلوقات کے قبل ایک اور چیز متفرع ہے۔ یہ شیونات الٰہی کہی جاتی ہے۔ شیونات الٰہی صفاتِ الٰہی اور مخلوقات کا درمیانی واسطہ ہیں وہ اپنے واسطے سے صفاتِ الٰہی کو مخلوقاتی ظہور میں لاتی ہیں جیسا کہ صفاتِ الٰہی ذات کو مخلوقاتی شان میں جلوہ گر کرتی ہے۔ شیونات الٰہی بھی بہت ہیں مگر اُم الشیونات تین ہیں۔ ربّیت[۱] - راحمیت[۲] - مالکیت[۳] اور ان کی اول شاخیں تین ہیں معبودیت[۱] - مستعانیت[۲] - ہادیت[۳] بالمنعمیت۔

شیونات الٰہی - ربّیتِ الٰہی

(۱) ربّیتِ الٰہی کو مانو اور عالمی یعنی عالمگیر ہمہ گیر ازلی دائمی شان میں مانو یعنی یوں مانو کہ کائنات کا کوئی گوشہ اور شوشہ نہیں ہے جس پر ربوبیت الٰہی کی بارشیں لگاتار نہ برستی رہتی ہوں، پوری کائنات میں ایک ہستی نہیں ہے جو اسکی غذاؤں سے پلتی نہ ہو، اسکی ہواؤں میں سانس نہ لیتی ہو۔ ربیت الٰہی کو اس لئے بھی مانو اور اس ڈھنگ سے مانو کہ اپنے اندر بھی ظلّی ربّیت عالمی پیدا کرو اور ظلّی ربوبیت عالمی کو برتنے لگو ___ ربوبیت الٰہی کی بیشمار شاخیں ہیں کلّی اور جزئی صورتوں میں کلّی شاخیں دو ہیں مادّی اور روحانی، مادّی شاخ مخلوقات کی مادّی بقا و ارتقا کی کفالت کرتی ہے روحانی شاخ مخلوقات کی روحانی حفاظت و تربیت و ترقیت و تکمیلیت کا اہتمام کرتی ہے۔ ان دونوں شاخوں کا کام تلازم اور توازن کے ساتھ ساتھ جاری ہے، خواہ محسوس کرو، خواہ نہ کرو، حقیقت احساس پر منحصر نہیں ہے۔ البتہ نفسانی انسان، ربوبیت روحانی کا غافلانہ مقابلہ کرتا رہتا ہے اور اس مقابلے کے سبب خسارہ اٹھاتا رہتا ہے پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ ربوبیت روحانی کا فیض اس کے لئے بالکل بند ہو جائے۔ شیطان سے شیطان [illegible] حتیٰ کہ خود شیطان اس کے فیضیوں سے محروم نہیں ہے۔ نفرت کی گہرائی شیطانی انسان اور خود شیطان میں بھی روحانیت کی ایک تڑپ رکھتی ہے اور اس الوہیت سے لپٹنا چاہتی ہے البتہ اس گہرائی پر سطحیت چھائی ہوئی رہتی ہے اس لئے

وہ غریب ابھرنے نہیں پاتی فطرت کی گہرائی کی یہ تڑپ کس کا کرشمۂ فیض ہے، اسی ربوبیت روحانی کا ہے ــــ ربوبیت مادی بھی گمراہ انسانوں میں مقابلے سے دوچار ہوتی رہتی ہے لیکن وہ بھی اپنے فیض جاری کو ان پر حرام نہیں بناتی نعمتیں نہ سہی قوت لایموت کے کچھ ٹکڑے ان کے دہن و شکم کے لئے بھی مقرر کر دیتی ہے اور ان کے کسی حیثیت سے جینے کا سامان کر دیتی ہے

(۲) ربوبیت الٰہی بلا بدل اور بالبدل دونوں طور سے فیض رسانی کرتی ہے۔ اس کے بالبدل فیض کا نام عطا اور اجر ہے۔ بلا بدل فیض کا نام وہب و فضل ہے۔ عطا انعام ہے مگر وہ انعام جو بدل کے سلسلے میں ہے یعنی محنت ہی کے معاوضے کا ضمیمہ ہے، اجر ٹھیٹھ مزدوری ہے۔ وہب با تبیین بخشش ہے فضل لاتعیین بخشش ہے وہب قاعدے کے ماتحت ہے۔ فضل قاعدے کے ماتحت نہیں ہے ــ ربوبیت بالبدل سبب اور کسب دونوں سے تعلق رکھتی ہے لیکن کسب سے مقدمی تعلق رکھتی ہے۔ سبب سے موخری تعلق اور اس تعلق کے لئے ایک ضابطہ مقرر کر دیا گیا ہے جس کے ٹھیک مطابق بالاستقلال و بلا نقص کام کرتی رہتی ہے جس ضابطے کو ہر مخلوق طبعاً جانتی ہے اور طبعاً اسی کے ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ اس فطری طریقے سے ربوبیت بالبدل اپنا کاروبار جاری رکھتی ہے ــ ربوبیت بلا بدل بھی ایک ضابطہ ضرور رکھتی ہے مگر اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ناممکن الاحاطہ ہے اور ناممکن البیان بھی کسب کو مقدم رکھنا یہ ہے کہ خود مختار انسانوں میں پہلے کسب کراتی ہے پھر اس سبب کو مہیا فرماتی ہے جس پر اپنے فیض کو مترتب فرماتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کے ذریعہ کسب کو کامیاب بناتی ہے اور کسب کے نتیجے اور اجر کی شکل میں اپنے انعام کو کاسب کے لئے پیش کر دیتی ہے۔ ربوبیت بالبدل کے ضابطے کی بنیادی دفعہ یہ ہے کہ خود مختار انسان بہ حالت خود مختاری کسب کرے تو اجر ملے، کسب نہیں تو اجر نہیں، البتہ بہ حالت معذوری بلا کسب بھی لازماً دیا جاتا ہے اور اس کا طریقہ جاریہ یہ رکھا گیا ہے کہ اس کو دوسروں کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے اس کی مربوبیت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کاسب کو اجر بلا سبب نہیں دیا جاتا ہے ــ قاعدہ

عمومی یہی ہے کہ سبب کے واسطے سے ہی دیا جاتا ہے اس طرح کہ کسب کے بعد سبب کو مہیا کردیا جاتا ہے اور اس کے واسطے سے اجر سپرد کردیا جاتا ہے ــــ ربوبیت الٰہی کے عام مطلق اور محیط کل ہونے میں بسا اوقات شبہ کیا جاتا ہے وہ اسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ضابطہ ربوبیت کی اس بنیادی دفعہ کا ان کی نظر میں کوئی وجود نہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان کی نظر میں ضابطۂ ربوبیت ہی کا کوئی وجود نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ربوبیت بے ضابطہ رحمت کا نام ہے اور کسب و سبب کی شرط کا وہاں کوئی جھگڑا نہیں مگر یہ بے چارے یہ نہیں جانتے کہ اس شرط کا جھگڑا نہ ہو تو انسان کی خودمختاری لغو ہو جاتی ہے۔ پھر انسانی دنیا بالکل بے نظام ہو جاتی ہے۔ پھر ارتقا کا کاروبار ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہتیرے فیضِ ربوبیت سے محروم نظر آتے ہیں اور اتنے محروم کہ پوری زندگی مصیبت میں گذار کر بُری طرح ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کی توجیہ یہی ہے کہ ربوبیت جہاں اپنی شرط فائدہ کو غائب پاتی ہے وہیں یہ واقعہ ہوتا ہے۔ واقعہ بھی ناگزیر ہے اور بااصول بھی ہے۔ یہ شرط چھوڑی نہیں جا سکتی ورنہ بےضابطگی پیدا ہوتی ہے۔ کاروبارِ الوہیت میں بے ضابطگی محال کے برابر ہے اور اس کی ایک خاص علت بھی ہے علاوہ اس کے کہ یہ ایک حقیقی اور فطری چیز ہے اور حقیقی اور فطری چیز چون و چرا اور سوال و اعتراض سے بالاتر ہے۔ یہ خاص علت یہ ہے کہ کاروبارِ الوہیت کی بے ضابطگی پوری کائنات کو بے ضابطگی میں ڈبو دینے والی چیز ہوتی اور یہ چیز کائنات کو ایک لمحے کے لئے بھی نہ چھوڑتی تسلسل قیام توڑی چیز ہے ــــــ

تب اس معذوری کے سوا جو بے ضابطگی سے پیدا ہوتی ہے اور انسانوں کا ایک حصہ اس کی وجہ سے تکلیف اٹھاتا ہے ربوبیت الٰہی کی عالمگیری بحث و سوال سے بالاتر ہے یہ معذوری بھی انسانی ارتقائی سلسلے میں آہستہ آہستہ ختم ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ وقت وہ ہوگا جب انسان کا ارتقائی سلسلہ ربوبیتی پہلو سے منتظم تکمیل کے قریب پہنچ جائے گا۔ جب کہ کسی ایک انسانی فرد کے لئے انسانی نظام میں بھی ناممکن ہو جائے گا کہ بےکسب کے اجر پائے اور یہ بھی ناممکن ہو جائے گا کہ کسب سے خالی رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(یعنی کسبِ مفید اور کسبِ مطلوب سے خالی رہے) ساتھ ہی ہر انسان اور جمعیتِ انسانی کے لئے اس کی روحِ ربوبیت کے کمال نشو و نما کی وجہ سے یہ بھی ناممکن ہو جائے گا کہ وہ کسی انسان کے فیضِ ربوبیت سے محروم رہنے کو گوارا کریں ——— یہ سلسلہ ارتقائی آہستہ آہستہ آگے ہی کو بڑھ رہا ہے۔ ربوبیتِ انسانی کے کام کو اختیاری حد تک انسان ہی کے سپرد کرتا جاتا ہے تاکہ انسان پوری طرح خلیفۃ اللّٰہیت کا فرض انجام دے سکے ——— ربوبیتِ الٰہی کی عالمگیری پر تھوڑے سے انسانوں کی کلفت و پس ماندگی کے مدِنظر جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا وزن یوں ہی کم ہو جاتا ہے کہ خود معترضین جو نقشہ بھی اِن بنیادی اصولوں کو جن پر باضابطہ ربوبیت قائم ہو سکتی ہے مدِنظر رکھ کر تجویز کریں گے وہ باضابطگی اور بااصولی کی وجہ سے اس معذوری سے خالی نہیں ہو سکتا جو ربوبیتِ الٰہی کو موجودہ صورت میں لاحق ہے اور اسوقت تک اس سے خالی نہیں رہ سکتا جبتک انسانی ارتقا حدِ کمال کو نہ پہنچ جائے۔ اس سے پہلے اسکے خالی از معذوریت ہونے کی دو ہی صورت ممکن ہے، ایک یہ کہ انسان کو انسان نہ رہنے دیا جائے فرشتہ بنا دیا جائے، دوسری یہ کہ انسان سے اختیار کو بالکل چھین لیا جائے اور نبات و جماد بلکہ بے رُوح مشین کی طرح اس کو مجبورانہ زندگی میں دھکیل دیا جائے اور یہ دونوں چیزیں اساسًا غلط ہیں۔ پُر تکلیف اختیاری زندگی پُر راحت مجبورانہ اور مشینیانہ زندگی پر ہزار بار مرجّح ہے ———

ربوبیتِ الٰہی اس نکتے کو سمجھتی ہے اور اس لئے اپنے کو اس راہ پر چلا رہی ہے جسکو بے معرفت تخیلی انسان اعتراض کی نظر سے دیکھتا ہے اور ناحق پریشان ہوتا ہے پھر وہ غلط تخیلی نقشے بنا کر ایسے مضرت رساں تجربوں پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ربوبیتِ الٰہی کو حقیقت انتہائی و واقعی کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر اور اسکی صحیح معرفت حاصل کر کے اسی جادہ پر چلتا رہے اور بجائے نئی پگڈنڈیاں پیدا کرنے اور انھیں آزمانے کے کھلی شاہراہ پر گامزن رہتے ہوئے حرکتِ ارتقا کو تیز سے تیز تر بناتا رہے ساتھ ہی یہ امید دل میں رکھے کہ جس مقصد کو بیراہ رویوں سے جلد حاصل کرنا چاہتا ہے اور نہیں حاصل کر سکتا شاہراہ راہ روی جلد تر حاصل ہو

کرے گا، بشرطیکہ ارتقا کو تیز کرنے میں سستیاں نہ دکھائے۔ اسی تجویز کو ایک خاص نحوی توسیع کے ساتھ ربانیت کہا گیا ہے بس یہی ربانیت ہے اور اس کے مقابل جو کچھ بھی آج سوچا جا رہا ہے نفسانیت ہے خواہ وہ اشتراکیت کی نیم نفسانی نیم ربانی صورت میں ہو خواہ فرعون استعمالیت اور دو ہیّت (سرمایہ داری) کے نفسانی کامل کے رنگ میں ہو، فافہم و تدبر و لا تکن من الجاہلین۔

راحمیّت الٰہی

(۱) راحمیّت الٰہی ربیّت الٰہی کا ضمیمہ بھی ہے اور ایک مستقل صفت الٰہی بھی ہے مگر ماتحت ربیّت ہے ایک پہلو سے جیسا کہ اساس ربیّت ہے دوسرے پہلو سے۔ راحمیّت الٰہی ربیّت الٰہی کو وہ خاص ربیّت بناتی ہے جس کو معیاری ربیّت کہنا چاہیئے۔ ربیّت دو قسم کی ہوتی ہے ربیّت بالراحمیّت جس کا منشاء رحمت ہے اور ربیّت بے راحمیّت جس کا منشاء ضرورت یا عادت ہے، ربیّت بالراحمیّت ہی معیاری ربیّت ہے۔ ربیّت بے راحمیّت معیاری ربیّت نہیں ہے۔

ربیّت الٰہی ربیّت بالراحمیّت ہے۔ ربیّت بے راحمیّت نہیں ہے۔ ربیّت بالراحمیّت ہی حمد کا حق پیدا کرتی ہے اور حمد کو واجب ٹھہراتی ہے۔ ربیّت بے راحمیّت یہ مرتبہ نہیں رکھتی۔ انسانی ربیّت عموماً بے راحمیّت ربیّت ہوتی ہے اس لئے حمد کی مستحق نہیں ہوتی ہے البتہ بعض بعض جگہ اور وہ شاذ و نادر ہیں۔ ربیّت بالراحمیّت بھی ہوتی ہے اور اس لئے وہ بھی حمد کی مستحق ہوتی ہے مگر ظلّی حمد کی مستحق اسلئے کہ اصلی حمد تو مخصوصات الٰہی سے ہے۔ اسکی سب سے اعلیٰ مثال ربیّت محمدی ہے۔ انسان اگر حمد کا (ظلاً ہی) حقدار بننا چاہتا ہے اور ضرور بننا چاہیئے کیونکہ یہ ارتقا اور تکمیل کی بات ہے تو اسکو لازم ہے کہ اپنی ربیّت کو ربیّت بالراحمیّت بنائے، ربیّت بے راحمیّت پر قناعت نہ کر بیٹھے۔

راحمیّت الٰہی دو قسم میں بٹی ہوئی ہے۔ راحمیّت رحمانی، راحمیّت رحیمی۔ راحمیّت رحمانی رحمانیت کہی گئی ہے، راحمیّت رحیمی رحیمیت کہی گئی ہے۔ رحمت دو طرح کی ہوتی ہے۔ رحمت تخلیقی اور رحمت تربیتی۔ یعنی وہ رحمت جو تخلیق کیلئے ہوتی ہے اور تخلیق کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ رحمت جو تربیت کیلئے ہوتی ہے۔ تخلیقی رحمت کی راحمیّت رحمانیت کہی گئی ہے۔

رحمانیت مخصوصات الٰہی سے ہے، تربیتی رحمت کی راحمیت رحیمیت کہی گئی ہے اور وہ عام چیز ہے، ربیت الٰہی دونوں راحمیتوں اور دونوں رحمتوں کا مجمع ہے، انسانی ربیت صرف رحیمی راحمیت رکھ سکتی ہے۔ رحمانی راحمیت نہیں رکھ سکتی اور یہ اس لئے کہ انسان تخلیقی شان ہی سے محروم ہے۔ وہ صرف پال سکتا ہے پیدا نہیں کر سکتا ـــــ راحمیت رزاقیت کو بھی سمیٹے ہوئے ہے اور اس جڑ کی جتنی شاخیں ہیں ان سب کو لپیٹے ہوئے ہے۔

(۲) ربیت الٰہی کے ساتھ ساتھ راحمیت الٰہی پر بھی مع اس کے دونوں قسموں کے ایمان لاؤ اور راحمیت الٰہی سے بھی پرتوگیری کی کوشش کرو یعنی اپنے اندر بھی راحمیت کا جوہر پیدا کرو (اگرچہ عکس ہی ہوگا راحمیت الٰہی کا) اور اس طرح اپنی ربیت و ربوبیت کو بھی راحمانہ ربیت و ربوبیت بنالو تاکہ حمد کے استحقاق میں بھی ظلی طور پر حصہ لگا سکو اور اس راستے سے بھی تشبہ باللہ اور خلافت اللہ کی شان اعلیٰ حاصل کر سکو جو تمہاری خلقت کی اصلی غرض ہے جس کے بغیر تم اصلی انسان ہی نہیں بن سکتے۔

مالکیت الٰہی (۱) مالکیت الٰہی۔ ربیت الٰہی کی ضمنی صفت بھی ہے اور مستقل صفت بھی ـــــ ہے۔ اس طرح کہ ربیت الٰہی مالکیت سے خالی نہیں ہو سکتی وہ جب ہے اور جہاں بھی ہے مالکیت کے ساتھ ہی ساتھ ہے۔ وہ کبھی عاجزیت کا ساتھ یا بیگانگت کا ساتھ نہیں گوارا کر سکتی، اس کی ربیت ہمیشہ مالکانہ رہتی ہے۔ ہمیشہ مالکانہ ہی رہے گی اور ہمیشہ مالکانہ ہی ہو سکتی ہے اس کی ربیت نہ عاجزانہ ہے نہ عاجزانہ ہو سکتی ہے ـــــ مالکانہ ربیت اور عاجزانہ ربیت میں جو کھلا ہوا فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ عاجزانہ ربیت صرف ادھوری ربوبیت پیش کر سکتی ہے اور اس سے ادھوری ہی مربوبیت ہاتھ آسکتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں ہے۔ پھر عاجزانہ ربوبیت غلط ربوبیت بھی پیش کر سکتی ہے اور ربوبیت کو غلط کر دے سکتی ہے۔ مالکانہ ربیت پوری اور صحیح ربوبیت پیش کرتی ہے۔ بشرطیکہ راحمیت سے بے سروکار نہ رہے۔ جب ربوبیت کی تمنا کرو تو مالکانہ ربیت کی تمنا کرو عاجزانہ ربیت کی نہیں۔ جب ربیت کو حاصل کرو تو مالکانہ ربیت کو حاصل کرو عاجزانہ ربیت کو نہیں۔ ادھوری چیز کیوں چاہی جائے اور کیوں لی جائے حوصلہ بلند اور

ارادہ ارجمند رکھو ہمیشہ پوری چیز چاہو اور پوری چیز لو۔ مگر یہ نہ ہو کہ مالکانہ ربوبیت ملنے تک عاجزانہ ربیت کو ٹھکراتے رہو اور اس کی ادھوری برکت کو ہوا میں بکھیر دو۔ بلکہ یہ ہو کہ عاجزانہ ربیت جب تک بٹتی رہے اس کو بھی پاس پڑا رہنے دو اور اس کی برکتوں کو بھی لٹاتے رہو۔ اشرفیاں نہ ہوں تو کیا پیسوں کو خیرات نہیں کرتے رہنا چاہئے۔ البتہ یہ ہو کہ عاجزانہ ربوبیت پر قناعت کی چادر نہ تان دو آگے بڑھتے رہو اور جب تک مالکانہ ربیت کی منزل نہ آجائے۔ قناعت کا دم نہ لو اور طلب کے قدم کو نہ روکو۔ دیکھو حضرت محمدیت نے کیا کیا جب تک مالکانہ ربیت نہیں ملی عاجزانہ ربیت کے دراہم لٹاتے رہے ساتھ ہی ساتھ مالکانہ ربیت کے لئے قدم مارتے رہے جب مالکانہ ربیت ہاتھ آگئی تو اس کے دنانیر کی بارشیں بھی برسانے لگے۔

۔۔۔ مالکیت اصلی بیشک حضرت الوہیت ہی کے لئے ہے اس میں کسی مخلوق کے لئے کچھ حصہ نہیں لیکن ظلی مالکیت مخلوق کے حصے کی بھی چیز ہے بلکہ اسی کی چیز ہے۔ حضرت الوہیت میں تو اصلیت ہی اصلیت ہے ظلیت کہاں "

(۲) مالکیت حاکمیت بھی ہے اور حاکمیت سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ زیادہ چیز خالقیت ہے۔ مالک حاکم بھی ہے اور خالق بھی ہے۔ پس ہر مالک حاکم ضرور ہے۔ مگر ہر حاکم مالک نہیں ہے اسی لئے مالک حاکم صرف حضرت الوہیت ہے دوسرے صرف حاکم ہیں وہ بھی ناقص حاکم کامل حاکم نہیں پس مالکیت الٰہی حاکمیت الٰہی کو بھی شامل ہے اور اس حاکمیت کو جوہر مالکانہ ہے۔

(۳) مالکیت الٰہی ایک اور بڑی بنیادی صفت کو لپیٹے ہوئے ہے وہ قادریت ہے جو قدرت سے بنتی ہے۔ پس مالکیت الٰہی حاکمیت الٰہی کی طرح قادریت الٰہی کو بھی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، اور اس طور چھپائے ہوئے ہے جس طور عمارت بنیاد کو چھپائے ہوتی ہے قادریت الٰہی ہی ہے جو مالکیت کو حاکمیت کا رنگ بخشتی ہے اور اس کی حاکمیت کو شان نافذیت عطا کرتی ہے۔ قادریت الٰہی ایک خصوصیت رکھتی ہے جو دوسری قادریتوں کو نصیب نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ یہ خصوصیت محیطیت ہے

یعنی محیط ہوگا ہر چیز پر اور ہر چیز کے ہر پہلو پر جس طرح دائرہ نقطہ کو محیط ہوتا ہے بلکہ جس طرح قوت شئے شئے کو محیط ہوتی ہے۔ قادریتِ الٰہی قدرتِ محیطہ ہے جو کائنات کی ہر چیز کو اور اس کی ہر چیز کے ہر پہلو کو گھیرے ہوئے ہے۔ قادریتِ انسانی قدرتِ محیطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتِ انسانی حکومتِ نافذہ نہیں ہوتی، یعنی نافذہ کاملہ نہیں ہوتی۔ اور اس لئے بھی انسانی حکومت اصلی حکومت نہیں ہے بلکہ ظلّی حکومت ہے، اور چونکہ انسانی حکومت اصلی حکومت نہیں ہے اس لئے وہ دو قسم کی حکومتوں میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے نیابتی حکومت اور بغاوتی حکومت۔ نیابتی حکومت کو خلافت اور خلافت الٰہی کہتے ہیں۔ جو حاکمیت الٰہی کے ماتحت قائم ہوتی ہے اس کی بالکل نقل ہوتی ہے اور اس کے بالکل پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ بغاوتی حکومت وہ انسانی حکومت ہے جو حاکمیّت الٰہی کے ماتحت نہیں بلکہ اس سے بالکل آزاد قائم ہوتی ہے

حاکمیت الٰہی نے ایک باضابطہ حکومت پیدا کر رکھی ہے، اس کو حکومتِ الٰہی کہتے ہیں، یہ حکومت پوری کائنات پر پھیلی ہوئی اور پوری کائنات میں تیری ہوئی ہے، ازل سے چلی آ رہی ہے ابد تک چلی چلے گی، وہ ازل اور ابد جنکی کوئی حد و نہایت نہیں — یہی حکومت یعنی حکومت الٰہی، بلاواسطہ حضرتِ الوہیت کی حکومت ہے، اور بالواسطہ تو ہر ربّانی حکومت جو خلافت اور نیابت کے اصول پر قائم ہوتی ہے حضرت الوہیت کی حکومت ہے۔ مگر چونکہ وہ بالواسطہ حضرت الوہیت کی ہوتی ہے اور بلاواسطہ انسان کی ہوتی ہے، اس لئے اس کو حکومت الٰہی کہنا حقیقتاً صحیح نہیں ہے، صرف مجازاً صحیح ہے — حکومت الٰہی ہی انسانی حکومتوں کے صحیح اور غلط ربّانی اور نفسانی مقبول اور مردود ہونے کا اکیلا معیار ہے۔ پس اسی ایک معیار پر انسانی حکومت کو ناپنا تولنا چاہیئے۔ جو اس پر پوری اترے مقبول، جو نہ اترے مردود، اور مردود ہی نہیں واجب المحو بھی، یعنی جس کا مٹا دینا واجب اور ضروری ہے۔ یہ حکومت یعنی حکومت الٰہی، انسانی دنیا میں اپنے ظاہری حصے کے لئے خلافتی حکومت کا تقاضا بھی کرتی ہے جو قائم ہو کر اس کی کارندگی و نمائندگی کرتی رہے، خود مختار ظاہری انسانی دنیا میں اور انسانیت کو اپنے وجود سے ربّانی فوز و فلاح والی مخلوق بننے میں مدد پہونچاتی رہے — حکومت الٰہی کا یہ تقاضا پورا کرتے رہنا انسان کا سب سے پہلا اور سب سے اعلےٰ فرض ہے۔ اگر یہ فرض ادا نہیں کیا گیا

اور اگر زمین و آسمان کی کشادگی برابر بھی فرائض ادا کر ڈالے گئے تب بھی یہ کہا جائے گا کہ انسان نے
اپنا فرض ادا نہیں کیا، اور اس کی ذات سے انسانیت کا بھلا نہ ہو سکا۔ حکومتِ الٰہی کا یہ تقاضا اپنے
اندر ایک اور فطری تقاضا بھی چھپا ہوا رکھتا ہے وہ یہ کہ انسانی دنیا کی بغاوتی حکومتوں کی اکھاڑ
پچھاڑ ہوتی رہے تاکہ خلافتی حکومت بخوبی جم اور تھم سکے اور خوبی پھولے پھلنے پا سکے —
اسی ضرورت کے لئے حضرت الوہیت نے جہاد کو فرض ٹھہرایا اور قیامت تک کے لئے مستقل اور
مستقل بنا دیا اور اس کو وہ تقدس بخش دیا جو کسی دوسرے عمل کو نہیں بخشا — ہر وہ
انسانی حکومت جو خلافتِ الٰہی نہیں ہے یعنی نیابتِ حکومتِ الٰہی کی بنیاد پر نہیں کھڑی ہے
بغاوتِ شیطانی ہے، باغیانہ حکومت ہے، شیطانی حکومت ہے اور اس کو زمین پر انسانوں
کے اندر ایک لمحہ ٹھہرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کو مٹا کر رہنا چاہئے اور مٹا کر رکھنا چاہئے،
خواہ یہ باغیانہ حکومت رہبانی حکومت کے بھیس میں ہو جو تقدس کی پوشاک میں ربانیت کا
گلا گھونٹتی ہے اور حکومتِ الٰہی کے ربانیتی منشا کو پورا ہونے سے روکتی ہے یعنی ربوبیتِ الٰہی
اور ربوبیتِ الٰہی کی نعمتوں کو انسان تک پہنچنے اور انسان کو اس تک پہنچنے میں رکاوٹ سے
دوچار کراتی رہتی ہے، خواہ ہیولانی حکومت کے لباس میں ہو، بے اصول اور لاپروا حکومت کا نام ہو،
خواہ کھلے شیطانی جامے میں ہو جس کو عرف میں بھی شیطانی حکومت کہا جاتا ہے۔

(۳) مالکیتِ الٰہی کو اس تفصیلی نقشے کے رنگ میں ماقوچا پرویا گیا ہے اور اس نقشے کے رنگ میں
مالکیتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ اتنی باتیں اور مانو — حاکمیتِ الٰہی کو مانو، حکومتِ الٰہی کو مانو، خلافتِ الٰہی کو
مانو جس کو حکومتِ ربانی بھی کہا گیا ہے، خلافتِ الٰہیہ! فرد رہنا اور فرضیت کو مانو اور اگر وہ کبھی
موجود نہ ہو تو اس کی موجودگی کی کوشش کی فرضیت کو مانو۔ باغیانہ حکومت کی بیخ کنی کی فرضیت
کو مانو، اور جہادِ ربانی کو مانو، ان باتوں کو ایک عمر بھی مانو، عمل سے ماننا یہ ہے کہ ان کی عملی
تعمیل میں کچھ لگے رہو اور ان کو تکمیل تک پہنچانے کی دھن میں ڈوبے رہو۔

محکومیتِ الٰہی (۱) محکومیتِ الٰہی حاکمیتِ الٰہی ہی کی ایک کڑی ہے اور لازمی کڑی
اور فطری کڑی [illegible] کی ... ہے اور احمیت اور مالکیت، ربوبیت
الٰہی کی ہی دوسری [illegible] اور لازمی [illegible] فطری [illegible] کہلاتی ہیں — کہاں کیسا ہے

اور کس طرح ایسا ہے؟ اس طرح ہے اور یوں ہے کہ ربّیت حقِ معظّمیت کو واجب کر دیتی ہے یعنی جو رب ہے ضرور ہے کہ معظّم ٹھہرایا جائے، معظّمیت ہی معبودیت ہے۔ کیوں ضرور ہے کہ رب معظّم ٹھہرایا جائے؟ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہو تو مربوب، رب سے صرف یکطرفہ رابطہ قائم کر سکے گا، یعنی وہ رابطہ جو رب کی طرف سے چلتا ہے اور رب کی محبّت و عنایت اور رحمت و شفقت کو مربوب پر طاری کرتا ہے، دوطرفہ رابطہ نہیں قائم کر سکے گا۔ یعنی اس رابطے سے محروم رہے گا جو خود اس کی طرف سے یعنی اس کی ممنونیت و شاکریت کی طرف سے رواں ہوتا ہے۔ دوطرفہ رابطہ یکطرفہ رابطے کے مقابلہ میں دُگنی طاقت تو یقیناً رکھتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بے حساب زیادتی بھی رکھتا ہو۔ رابطہ جتنا طاقتور ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ جاذب الفیض اور جالب النفع بھی ہوتا ہے۔ تب مربوب اگر رب کو معظّم ٹھہرانے کا عمل نہ کرے تو اپنے رابطہ بالرّب کو یکطرفہ اور کمزور بنا کر فیض ربوبیتی کے معاملے میں خسارے میں رہے گا۔ تب ضروری ہے اپنے ہی نفع کی خاطر رب کو معظّم ٹھہراتا رہے اور معظّم ٹھہرانے کا کام کرتا رہے۔ اس طرح ربیت کو معظمیت مل جاتی ہے۔ پھر اگر مربوب اس حقیقت کی پروا نہ بھی کرے اور ربیت کو عملی معظمیت نہ ہی مل سکے تب بھی استحقاقِ معظمیت کے لازمی ہونے میں تو کوئی کور کسر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ربیت احسان ہے۔ احسان معظمیت کے استحقاق کو رب کے لئے یقینی ٹھہراتا ہے۔ کیونکہ احسان معاوضہ چاہتا ہے۔ معاوضہ اُس محسن کے لئے جو کسی اضافتی معاوضے کا محل نہیں بن سکتا معظّمیت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضرتِ الوہیت یقیناً ایسا ہی محسن ہے جو کسی اضافتی معاوضے کا محل نہیں بن سکتا یعنی اُس کو کوئی ایسا معاوضہ نہیں دیا جا سکتا جو اس میں کچھ اضافہ اور زیادت کر سکے۔ تب اس کو مربوب کی طرف سے ایک ہی معاوضہ کی پیشکش دی جا سکتی ہے۔ وہ معظّمیت ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے کسی عمل سے اس کو معظّم ٹھہرانے کا فرض بجا لائے۔

معبودیت قدرتاً عابدیت اور عبادت کو ڈھونڈتی ہے۔ تب معبودیتِ الٰہی یقیناً عابدیت اور عبادت کو چاہتی ہے اور مانگتی ہے۔ یوں عابدیت اور عبادت فرض ہو جاتی ہے ـــــ پس حضرتِ الوہیت کو اپنا رحمٰن و رحیم اور مالک مانتے ہوئے معبود بھی مانو پھر اس کی معبودیت کا حق بھی ادا کرو۔

اسطرح کہ اپنے کو عابد بناؤ اور حضرت معبودیت میں عبادت کی پیشکش پیش کرتے رہو اسطرح بھی جسطرح
تمہارا جی چاہے بشرطیکہ وہ چاہنا اسکی کسی مسلمہ شان کے خلاف نہ ہو اور اسطرح بھی جس طرح تمہیں
اوپر سے بتایا گیا ہو۔ ایک بنیادی شرط معبودیت کے ماننے کی توحید ہے۔ اس شرط کا ضروری لحاظ رہے
معبودیت کو توحید اور وحدت کے ساتھ مانو۔ شرک اور شرکت کے ساتھ نہ مانو یعنی یہ نہ کرو کہ معبودیت میں
اسکے ساتھ دوسرے کو بھی شریک کر بیٹھو۔ اگر تم شرک کر بیٹھے تو معبودیت کا اقرار ایمان اور اطاعت
نہیں رہ جائے گا کفر اور بغاوت بن جائیگا۔ اور عابدیت و عبادت تہینیت اور اہانت کی شکل اختیار
کرے گی۔ —— معبودیت وحدت سے کیوں لپٹی رہنا چاہتی ہے۔ شرک کو کیوں جائز نہیں کر لیتی
اسکا کیا حرج ہے اگر کروڑوں دوسرے بھی معبود بنا لیے جائیں۔ اسلئے کہ شرک و شرکت امکان ہی میں
نہیں ہے۔ جب الوہیت میں شرکت نہیں گھس سکتی تو ربوبیت میں بھی نہیں گھس سکتی، جب ربوبیت
میں نہیں گھس سکتی تو معبودیت میں کیسے گھس سکتی ہے۔ توحیدیت اور وحدت اس پورے سلسلے
کی مشترک خصوصیت ہے۔ یہ ساری کڑیاں آپس میں اس طرح مرتبط ہیں کہ گویا کل ایک ہی
ہیں۔ پس جو رنگ ایک کا ہے وہی سب کا ہے پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان میں سے ایک محصور الوحدت
ہو باقی ممتنع الشرکت ہوں۔ اگر ایک ملتزم الوحدت ہے تو سب کا مؤکد الوحدت ہونا ضروری ہے
الوہیت کا واجب الوحدت ہونا تو کھلی بات ہے۔ تب معبودیت بھی یقیناً لازم الوحدت ہی ہو سکتی
ہے اور محتمل الکثرت ہرگز نہیں ہو سکتی —— البتہ ظلی معبودیت کی گنجائش نکل سکتی ہے جیسا کہ
ظلی الوہیت ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن ظلی معبودیت معبودیت نہیں کہلا سکتی مطاعیت کہلا سکتی
ہے جسطرح ظلی اللہیت "اللہیت" نہیں کہلا سکتی خلیفۃ اللہیت کہا سکتی ہے اور کہلاتی ہے
ظلی معبودیت کے لئے عبادت روا نہیں ہے۔ البتہ اطاعت جو ظلی عبادت ہے روا ہے اس شرط کے
ساتھ کہ اطاعتِ مطاعی اطاعتِ الٰہی سے ٹکر نہ لیتی ہو —— خلاصہ یہ کہ کوئی ماسوائے اللہ معبود نہیں
ہو سکتا —— معبودیت مطاعیت کو بھی لپیٹے ہوتی ہے تب معبودیتِ الٰہی مطاعیتِ الٰہی کو بھی
لپیٹے ہوئے ہے۔ پس حضرتِ الوہیت معبود بھی ہے اور مطاع بھی ہے یعنی عبادت کے بھی قابل ہے اور اطاعت
کے بھی لائق ہے —— تب معبودیتِ الٰہی اطاعت بھی مانگتی ہے جیسا کہ عبادت مانگتی ہے —— تب اطاعت کو بھی مفقود کر کے
جیسا عبادت کو مفقود کر کے نہیں چل سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صرف عبادت ہی معبودِ الٰہی کو مطلوب ہے اطاعت نہیں

کٹنی کاٹ جاؤ۔ عبادت بے اطاعت کے یقیناً منہ پر مار دیئے جانے کے قابل ہے اور یقیناً منہ پر
مار دی جائے گی۔ عبادت بے اطاعت کے ڈالی ہے بے پھول اور پھل کی اور بے برگ و سایہ کی۔ ایسی ڈالی
کس کام کی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بے اطاعت کی عبادت کسی کام کی نہیں۔ عبادت ڈالی ہے اطاعت
پھول ہے پھل ہے پتی ہے سایہ ہے۔ پھر دونوں میں ایک اور نسبت بھی ہے جزو کل کی نسبت۔ عبادت
جزو ہے اطاعت کل ہے۔ عبادت زندگی کے جسم کے لئے صرف قمیص ہے اطاعت وہ چادر ہے جو پورے
جسم کو لپیٹ لیتی ہو۔ عبادت زندگی کے صرف ایک موقت جزو کا وہ بھی مختصر جز کا ضابطہ عمل ہے
اطاعت پوری زندگی کا مکمل ضابطہ ہدایت ہے۔ پھر دونوں میں مقصد اور تمہید کی بھی نسبت
ہے۔ عبادت صرف تمہید ہے اطاعت مقصد ہے۔ عبادت صرف اس لئے ہے کہ اطاعت
کے لئے دل کی زمین کو طیار کر دے۔ اطاعت خود اپنے لئے ہے یعنی بذاتہ ایک مقصد ہے ———
معبودیت الٰہی بھی ربوبیت الٰہی کی مانند ایک عالمانہ شان ہے جو اپنے خاص قانون عمل کے ماتحت
اپنا خاص عمل کرتی رہتی ہے جیسا کہ ربوبیت الٰہی اپنے خاص قانون عمل کے ماتحت اپنا خاص عمل
کرتی رہتی ہے۔ معبودیت الٰہی کا ایک عمل تقرب و تولّی ہے یعنی نزدیکی بخشنا اور دوستی عطا کرنا۔
یہ عمل اس عبادت کے مقابلے میں ہے جو مقررہ الٰہی قانون عبادت کی مطابقت کے ساتھ واقع
ہوتی ہے۔ دوسرا عمل تبعّد و تبرّی ہے۔ بیزاری اور دوری پیدا کر لینا۔ یہ عمل ترک عبادت
اور اس عبادت کے مقابلے میں ہے جو مقررہ الٰہی قانون عبادت کی مخالفت کے ساتھ انجام
دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ معبودیت الٰہی ربانی عبادت کو قبول کرتی
ہے اور اس کا پھل تقرب و تولّی کی شکل میں دیتی ہے اور ترک عبادت نیز نفسانی عبادت کو رد کرتی
ہے اور اس کا پھل تبعّد و تبرّی کی صورت میں دیتی ہے ——— ربانی عبادت وہ ہے
جو مقررہ الٰہی قانون عبادت کی مطابقت کی جائے اور اس کا نتیجہ ربوبیت افزائی ہو یعنی یہ کہ فکر
ربوبیت جذبہ ربوبیت عمل ربوبیت کی افزائش و ترقی ہو۔ نفسانی عبادت وہ ہے جو الٰہی قانون
عبادت کی مخالفت کے رنگ میں انجام دی جائے جس کا نتیجہ ربوبیت شکنی ہو یعنی یہ کہ فکر
ربوبیت جذبہ ربوبیت اور عمل ربوبیت لُٹ جائے یا ارتقا گھٹ جائے یا بالکل مٹ ہی
جائے ——— پس ربانی عبادت ہی صحیح عبادت ہے اور قابل اختیار عبادت ہے ——— پس

اگر کہیں یہ دکھائی دے کہ مدد کی مانگ موجود اور مدد غائب تو یقین کرو کہ یا تو مدد موجود ہے مگر دیکھنے والے دیکھتے نہیں یا مدد کی مانگ ربّانی طریق پر نہیں ہے نفسانی طریق پر ہے۔ اور ربانی بھی ہے تو تفویضی نہیں ہے۔ یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ مدد کی مانگ پر کبھی کبھی مدد نہیں بھی ملتی اور اس لئے نہیں ملتی کہ مدد مانگنے والے کی تقدیر میں مدد نہیں ہے غلط ہے۔ استعانت الٰہی کا قانون اعانت کبھی ٹوٹ نہیں سکتا نہ کسی کی تقدیر ایسی بن سکتی ہے جو قانون الٰہی کو توڑ ڈالے۔ پھر یہ بات ربوبیت اور راحمیت کے بالکل خلاف ہے کہ ایک حاجتمند مدد مانگے اور اس کو تقدیر کے عذر پر مدد نہ دیجائے۔ اگر ایسا ہو تو تقدیر کی نامعقولیت مسلّم ٹھہر جائے گی اور اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں بن پڑیگا۔ کہ تقدیر اس طور کی کیوں بنائی گئی جو ربّیت اور راحمیت، ربوبیت اور رحمت کی آبرو مٹا کر رکھ دے۔ ایک طرف ربیت عالمی اور راحمیت کلّی دوسری طرف یہ ظالمانہ تقدیر ـــــ البتہ یہ بات ہے اور یہ بالکل معقول بات ہے کہ مدد کی مانگ کا ربّانی طریق پر ہونا اور تفویضی شان میں ہونا مدد کی تین کی شرط ہے اور تقدیر بھی یونہی ہے۔ ہر شخص کی تقدیر کہ جو ربّانی طریق پر مدد مانگے گا اس کو ضرور مدد دیجائیگی جو ربّانی طریقے پر نہیں بلکہ نفسانی طریقے پر مدد مانگے گا۔ اسکو مدد نہیں دیجائے گی ـــــ یہ تقدیر بالکل معقول ہے یہ ہرگز ظلم نہیں ہے۔ یہ بالکل رحم ہے۔ اور عین رحم ہے۔ اس شرط کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے حاجتمند کی رفع حاجت بھی پکّی ہو جاتی ہے۔ اور حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ ایک نفع ہے۔ ساتھ ہی یہ ہوتا ہے کہ ربّانیت اور تفویضیت سے رشتہ لگ جاتا ہے۔ جو مستقل نفع کی چیز ہے اور جزئی حاجتوں کی قضا سے کہیں زیادہ نفع کی چیز ہے ـــــ ربّانی استعانت اور نفسانی استعانت میں کیا فرق ہے۔ ربّانی استعانت وہ استعانت ہے جو ربّانیت کی روش پر کی جائے۔ یعنے تصور ربّیت و ربوبیت کے ساتھ، جذبہ ربوبیت کے ساتھ، ضابطہ ربوبیت کے ساتھ، غایت ربوبیت کے ساتھ کی جاتی ہے اور جو اس خصوصیت کی وجہ سے شانِ ربّیت کو قطعاً ہلا چھوڑتی ہے اور شانِ راحمیت کو یقیناً لہرا دیتی ہے ـــــ نفسانی استعانت وہ ہے جو نفسانی روش پر کی جائے یعنے جس کا سارا تار و پود بس نفس ہی نفس ہو ـــــ تفویض کیا چیز ہے؟ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مع اپنے تمام سامانوں کے اور کل کائنات کے سامانوں کے حضرت الوہیت اور اس کی شانِ ربیت و مستعانیت کو بالکل سونپ دیا جائے۔ ظاہراً ہی نہیں باطناً بھی، رسماً ہی نہیں حقیقتاً بھی

اِس یقین کے ساتھ کہ حضرتِ اُلوہیت ہی مُسبّبُ الاسباب، راس الاسباب، بدل الاسباب ہے اور ایسی قوت وقدرت ہے کہ اس کی ایک نگاہِ عاطفت، پورے ذخیرۂ اسباب سے بے نیاز، پورے ذخیرۂ اسباب کی مجموعی قوتِ کاملہ کی مخالفت پر بھی اقتضار حاجت کے واسطے بالکل کافی ووافی ہے۔ خواہ وہ حاجت پُورے عالم کی پوری وسعت کے برابر وسیع ہو۔ خواہ پورے جہان کی پُوری سنگینی کے برابر سنگین ہو۔ پھر اس یقین کے ساتھ، کہ حضرتِ اُلوہیت کی شانِ ربوبیت اپنی خاصیتِ راحمیت کے اثر سے اور عمل سے اتنا مکمّل سراپائے رحمت ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو ربّانیت کے ڈھنگ پر پکارا جائے اور وہ نہ سُنے اور سُنی کو اَن سُنی کر دے ——— پس استعانت کو بھی لازم پکڑو، استعانت نہیں تو عبادت بھی عقلی پہلو سے لغو چیز ہے صرف عشقی پہلو سے البتہ کارآمد ہو سکتی ہے مگر عشقی پہلو ضابطہ اور حساب سے خارج چیز ہے۔ ساتھ ہی طے کر لو یہ بات اور جم جاؤ اس بات پر کہ تمہاری استعانت، ہمیشہ ربّانی ہو گی اور نفسانی استعانت سے اتنا ہی دُور بھاگو جتنا نفسانی عبادت سے۔ پھر استعانت کو تفریقی بناؤ تعریفی مت بناؤ!

ہادیتِ الٰہی مع منعمیتِ الٰہی

(۱)۔ ہادیتِ الٰہی یہ ہے کہ چھپی ڈھکی ہوئی راہ ربانیت کو روشن تر بنا دیا جاتا ہے (۲) ہادیتِ الٰہی بھی ایک شاخ ہے شانِ ربیتِ الٰہی کی اور ضمیمہ و نتیجہ ہے شانِ مالکیتِ الٰہی کا ——— جو مالک ہے وہ ہادی ضرور ہے اگر اس کی مالکیت نفسانی نہ ہو ربّانی ہو۔ کیونکہ مالکیت اپنے اندر مختاریت ہی نہیں رکھتی ذمّیت یعنی ذمہ داری بھی رکھتی ہے۔ ذمیت کا ایک قدرتی تقاضائے ہدایت بھی ہے یعنی جسکا ذمہ لیا گیا ہے اُسکو صحیح راہ بھی دکھاتے رہیں اور اس پر چلنے کی ترغیب کرتے رہیں۔ مالکیتِ الٰہی یقیناً ربّانی مالکیت ہے تب اس میں ہادیت کی شان ضروری ہے، مالکیت کا ایک پہلو تعزیریت کا بھی ہوتا ہے۔ تعزیریت کیسے قرینِ انصاف ہو سکتی ہے اگر ہدایت کی مدد اور ہدایت کی تنبیہہ مقدّم نہ ہو چکی ہو نفسانی مالکیت بے شک اس شرط کی پروا نہیں کریگی مگر ربّانی مالکیت کا دامن تو اس شرط کی چولی سے قطعاً بندھا ہوا ہے۔

(۳)۔ ہادیتِ الٰہی بھی اپنا ایک خاص عمل اور اپنا ایک خاص قانونِ عمل رکھتی ہے اور اسی کے

کہنا چاہیئے۔ اہتدائیت بہ شان اتقائیت ہے' یعنی ہدایت طلب کرنا اس رنگ میں کہ قبول ہدایت
کی صلاحیت بھی تیار رکھی جائے تاکہ جب ہدایت آن پہونچے تو اس کو فوراً قبول کر لینے میں نفس رکاوٹیں
نہ کھڑی کردے اور طلب ہدایت کی محنت اور التماسِ ہدایت کی زحمت ناحق رائگاں نہ چلی جائے ۔۔۔
ہادیتِ الٰہی قانون اہتدائیت اتقائی کی پوری پابند ہے' اتنی ہی پوری جتنی بارش سوکھے کھیتوں کو
ہرے کر دینے کی پابند ہے بشرطیکہ سوکھے کھیتوں کا مالک یہ پاگل پنا نہ کرے کہ اپنے کھیتوں کو ٹھیک
اس وقت جب بارش اس کو ترو تازہ کرنے کے لیے پورے جوش سے اتر رہی ہو جھاڑ جھنکاڑ کی
چادروں کے نیچے چھپا ڈالے ۔۔۔ پس ہادیتِ الٰہی کو بھی تسلیم کرو اور اس ڈھنگ میں تسلیم کرو کہ
اس سے ہدایت لینے کی کوشش کرو' اس طرح کہ ایک طرف ہدایت کی طلب کرو دوسری طرف
اتقائیت کا جوہر پیدا کرو اور انحرافیت سے خالی ہو جاؤ ۔۔۔ حق کو قبول کر لینے کی صلاحیت اتقائیت
ہے اور حق کو رد کر دینے کی عادت انحرافیت ہے۔

(۳) منعمیتِ الٰہی بھی ربیّتِ الٰہی کی ایک شاخ ہے اور ہادیتِ الٰہی کا ضمیمہ اور نتیجہ ہے۔ ربیّت
الٰہی کی ایک شان یہ بھی ہے کہ بھٹکے ہوؤں کی ہدایت کرتی رہتی ہے اور ان میں سے جو ہدایت قبول
کرتے رہتے ہیں ان پر نعمتیں برساتی رہتی ہے ۔ ربیت اپنی عمومی شان میں عام نعمت ربوبیت کو
عامتاً بانٹتی رہتی ہے' اور اپنی خصوصی شان منعمیت میں شانِ ہادیت کے واسطے سے خاص نعمت
نموئیت کو خاصتاً مبذول فرماتی رہتی ہے۔ نعمت ربوبیت نعمت عام اور دولت عمومی ہے جس کے
سفرۂ عام اور خوانِ یغما پر دشمن اور دوست کی کوئی تفریق نہیں کی جاتی ع بریں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست
اور جس کی عام لوٹ میں ابلیس بھی حصہ دار ہے جیسا کہ آدم حصہ دار ہے ع عزازیل گوید نصیبے برم ۔
نعمت نموئیت نعمت خاص اور دولت خصوصی ہے جس کے دسترخوانِ خصوصی پر دوست تو بیٹھ سکتے
ہیں دشمن نہیں بیٹھ سکتے مہدی ہی بیٹھ سکتے ہیں اور متقی ہی بیٹھ سکتے ہیں' مکذب اور منحرف
نہیں بیٹھ سکتے ۔

افعالیات الٰہی

(۱) افعال الٰہی شئونات الٰہی کا تنزلی مرتبہ ہیں جیسا کہ شئونات
الٰہی صفات الٰہی کا تنزلی نتیجہ ہیں اور صفات الٰہی ذات الٰہی کا
تنزلی مرتبہ ہیں یعنی ظہوری و نمودی مرتبہ ہیں ۔ (۲) افعال الٰہی جزئیاتی حیثیت سے بے شمار ہیں

کلیاتی حیثیت سے صرف وہ سات رہ جاتے ہیں جو نیچے لکھے جاتے ہیں

کریمیت ۔ خالقیت ۔ رازقیت ۔ قیومیت ۔ مدبریت ۔ معلمیت ۔ حاکمیت ۔۔۔ افعال الٰہی پر حقائق الٰہیہ
کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے افعال الٰہی آخری کڑی ہیں حقائق الٰہیہ کے سلسلے کی جن کے بعد ان کے نتائج
کی شکل میں مخلوقات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے ۔۔۔ افعال الٰہی حضرت الوہیت کے لئے مخصوص ہیں
حقیقت کی رو سے لفظ الٰہی ان کی توجیہ ہے جیسا کہ صفات الٰہی اور شیونات الٰہی ہیں اور خود
ذات الٰہی میں توحید ہے ۔ البتہ مجاز کی رو سے پوری مخلوقات میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ مجاز کا
مطلب دوئی اور شرکت یا اشتراک اور مبالغہ نہیں ہے مجاز کا مطلب بالواسطہ اور عکساً ہے
یعنی یہ کہ افعال الٰہی حضرت الوہیت میں تو بلا واسطہ اور اصلاً پائے جاتے ہیں ۔ مخلوقات
میں بالواسطہ اور عکساً پائے جاتے ہیں ۔۔۔ اور ساری مخلوقات میں سے انسان میں
زیادہ قریب حقیقت پائے جاتے ہیں ، اتنے زیادہ قریب حقیقت کہ انہیں حقیقی کہہ دینے کو
جی چاہتا رہتا ہے ۔۔۔ افعال الٰہی قطعی الاثر ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک مثال بمنزلہ محال ہے
جو یہ بتا سکے کہ کوئی فعل الٰہی کبھی ایک لمحے کے واسطے بھی عدم اثر رہا اور جہاں کہیں ایسا شبہ اٹھتا
ہے وہاں یہ کمی سمجھ کا نقص ہے وہاں بھی پورا پورا اثر ہے مگر قصور نظر اور قصور عقل سے دیکھا نہیں جاتا
اور سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ انسانی دنیا میں سیکڑوں ہزاروں احکام الٰہی ہیں جو ہر وقت
ہر جگہ بے شمار و بے حساب ٹوٹتے رہتے ہیں مگر حقیقت کیا ہے ، حقیقت یہ ہے کہ ہرگز نہیں
ٹوٹتے کبھی نہیں ٹوٹتے ان کا ایک خوشہ نہیں ٹوٹتا ان کا ایک ریزہ نہیں ٹوٹتا ۔ البتہ ایک
غلط فہمی کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے کہ ٹوٹتا ہے غلط فہمی کیا ہے ؟ غلط فہمی یہ کہ حکم کچھ ہیں اور
سمجھے کچھ جاتے ہیں ۔ مثلاً ایمان کے باب میں جو حکم ہے اس کی بابت سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ ہر ایک
کے لئے تنفیذی حکم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانا ہی چاہئے اور ہر ایک کو یہ حکم ماننا ہی چاہئے
حالانکہ یہ حکم تنفیذی نہیں ہے تجویزی ہے جبری نہیں ہے اختیاری ہے جس کا جی چاہے مانے
جس کا جی چاہے نہ مانے ۔ البتہ اس حکم کے ساتھ دوسرا اقتضائی حکم تنفیذی اور جبری ہے وہ کیا ؟ وہ
یہ کہ جو اس حکم کو مانے گا [illegible] اور جو نہیں مانے گا وہ سزا پائے گا ۔ اس روشنی میں دیکھیں گے تو
صاف نظر آئے گا کہ [illegible] دونوں میں سے ایک حکم بھی ٹوٹا نہیں ۔ جو حکم ٹوٹا ہوا بتایا جاتا

ہے تو خیر ٹوٹنے کے قابل ہی نہیں۔ وہ تو اپنے دائرہ حیثیت میں پورم پور پورا اُترنے کو ہے، کیونکہ جس کا جی چاہا ضرور ایمان لایا جس کا جی نہیں چاہا نہیں ایمان لایا۔ یہی حکم بھی تھا۔ دوسرا حکم بھی اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی نہیں ٹوٹا ہے۔ جو ایمان لایا یقیناً اُس نے انعام پایا۔ مادی انعام نہ سہی روحانی انعام سہی۔ جو ایمان نہیں لایا یقیناً اُس نے سزا پائی۔ مادی سزا نہ سہی روحانی سزا سہی ——— افعال الٰہی ہمیشہ کامل ہوتے ہیں ناقص کبھی نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ جہاں ناقص دکھائی دیتے ہیں وہاں بھی کاملیت ہی کاملیت ہے ناقصیت کا شائبہ تک نہیں ہے ——— رہا یہ کہ ناقصیت کیوں دکھائی دیتی ہے۔ تو یہ اس لئے ہے کہ وہاں کے قدر مقصود اور قدر مفروض میں فرق نہیں کیا جاتا، یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ قدر مفروض ہی یہاں کا مقصود بھی ہے، اس غلط فہمی کے بعد چونکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ یہاں قدر مفروض کے مقابلے میں نتیجہ کمتر ہے۔ بس حکم لگا دیا جاتا ہے کہ یہاں افعال الٰہی ناقص رہ گئے، کیونکہ ان کے پھل ناقص ہیں ——— حالانکہ پھل ناقص نہیں ہیں اور جب پھل ناقص نہیں تو افعال الٰہی بھی ناقص نہیں ——— مثلاً کارخانہ فطرت کی بہتیری چیزیں اَن گڑھ دکھائی دیتی ہیں اتنی ان گڑھ کہ انسانی کاریگریاں انہیں شرمندہ کر دیتی ہیں۔ ان چیزوں کا تماشا یقیناً یہ خیال پیدا کر دیگا کہ افعال الٰہی ان چیزوں میں پہنچکر یقیناً ناقص رہ گئے اور اتنے ناقص کہ بہتیرے انسانی افعال بھی ان کے مقابلے میں کاملیت کے نعرے لگا سکتے ہیں ——— مگر اصلیت کیا ہے، اصلیت یہ ہے کہ ان بظاہر ادھوری بھونڈی چیزوں میں بھی نقص نہیں، کمال ہی پڑا جھلک مار رہا ہے اور اس لئے ان آئینوں میں بھی افعال الٰہی کے جو چہرے رونمائی پا رہے ہیں وہ نقص کی تصویریں نہیں ہیں کمال ہی کی تصویریں ہیں ———
البتہ یہ نکتہ ان پر روشن ہو سکتا ہے جو کمال کی وسیع الحدود حقیقت کو حقیقت کی نظر سے پہچاننے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کمالیت کی تجلیاں گوناگون اور کاملیت کی تصویریں بوقلمون ہیں ان سب کو نظر میں رکھو پھر اس حقیقت کو نظر میں رکھو کہ کمال کا معیار کم و کیف کے اندر نہیں رہتا یعنی مقدار اور شکل کے اندر موجود نہیں ہے بلکہ زمان و اتقان اور استعداد و امکان کے اندر بسیرا رکھتا ہے۔ کامل ہونے کی شرط اور پہچان یہ نہیں ہے کہ ایک چیز اتنی لمبی

چوڑی ہو اور یہ شکل و صورت رکھتی ہو بلکہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دیرپا ہو، زیادہ سے زیادہ پائدار ہو تنوع و ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ استعداد اور امکان رکھتی ہو۔ اور تم جتنا جانچوگے اتنا پاؤگے کہ مخلوقات الٰہی بہ مقابلۂ مصنوعات انسانی اس معیار میں آگے سے بھی آگے ہے۔

افعال الٰہی ہمیشہ خیری ہوتے ہیں خیر محض صادر کرتے رہتے ہیں۔ کبھی شری نہیں ہوتے کبھی شر کو نہیں ابھارتے نہ ابھار سکتے کیونکہ شر ان کی بلکہ ان کی اصل و بنیاد خود حضرت الوہیت کی بھی حقیقت ہی شر کی ضد مطلق ہے۔ اور ضد ضد کو پیدا کر سکتا ہی نہیں ہے۔ جو افعال الٰہی صورتاً شر آفریں دکھائی دیتے ہیں وہ بھی اصلیت کی رو سے خیر اور خیر محض ہی ہیں۔ پھر صورتاً کیوں شر کی تصویر ہیں بلکہ خود شر ہیں۔ اس کا سر عمیق یہ ہے کہ ان کی حقیقت ہی عمیق ہے اور اس لئے سنجیدہ ہے۔ مثلاً ہلاکیت کا فعل الٰہی جس کا کام صرف مارتے رہنا ہے کیا شک ہے کہ صورتاً شر محض ہے لیکن حقیقت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صورت کے بالکل برعکس خیر محض ہے۔ کیونکہ اسکی علت خیر ہے اس کی غایت خیر ہے۔ اس کی علت کیا ہے مثلاً بدی کی سزا۔ بدی کی سزا کو کون شر کہہ سکتا ہے۔ اس کی غایت کیا ہے مثلاً بدی سے ترہیب (ڈرانا) نیکی کی ترغیب۔ اس غایت و غرض کو کون خیر اور خیر محض نہیں کہے گا۔

(۳)۔ افعال الٰہی، افعال انسانی کے لئے معیار و مقیاس کا حکم رکھتے ہیں اور سانچے اور نمونے کی شان رکھنے والے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دعوت و پیغام بھی ہیں انسانوں کے لئے کہ اگر وہ اپنا بھلا چاہتے ہیں اور فوز و فلاح کا منہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے اور اتنا بڑا فرض کہ شاید ہی کوئی فرض اس سے آگے بڑھ سکے کہ اپنے افعال کو افعال الٰہی کے سانچے میں ڈھالا کریں اور ان کی ہمرنگی کے درپے رہا کریں ——— پس تم اس حقیقت کو پہچان کر اور اس پیغام کو گوش نشین کر کے اس بات کو جتنے کرلو کہ تمہارے افعال افعال الٰہی ہی کے نمونے پر ڈھلیں گے اور انہیں کی ہمرنگی کریں گے۔ تاکہ تمہاری زندگی زندگی الٰہی کا پرتو ٹھہر سکے، اور تمہاری خلقت مشیت سے ٹکراؤ کا سامان نہ بن جائے۔ بلکہ تم رحمت و برکت الٰہی کے مورد بن سکو اور زحمت و نقمت الٰہی سے خود کو بچائے چل سکو!

کونیات (خلقیات)

عالمیات

حقائقِ عالمی

(۱) ماسوائے اللہ بحیثیت مجموعی عالم کہلاتا ہے یعنی حضرت الوہیت کے سوا جتنی چیزیں ہیں ان کا مجموعہ بناؤ تو اس کا نام عالم رکھا جائے گا۔

(۲) عالم مجموعی حیثیت سے تو ایک ہی ہے۔ اور اس طرح موجود کلی صرف دو چیزیں ہیں۔ اللہ اور عالم۔ لیکن اپنے اجزا کی جزئیاتی حیثیت سے بے شمار حصوں اور قسموں میں بٹا ہوا ہے — البتہ کلیاتی حیثیت سے صرف چار بڑی قسموں میں منقسم ہے جنسی عالم، نوعی عالم، صنفی عالم، شخصی عالم اور ان میں سے ہر عالم بے شمار ہے، اور جب خود عالم بے شمار ہیں تو اشیائے عالم کی بے شماری کا کیا پوچھنا — یہ جو کہا گیا کہ موجود کلی دو ہیں تو یہ تسامحاً کہا گیا ہے یعنی حقیقت سے ہٹ کر کہا گیا ہے۔ تسامحاً یعنی حقیقت سے ہٹ کر یہ بات کیوں کہی گئی اس لئے کہ عرف عام میں یوں ہی کہا جاتا ہے، اور بعض اوقات عرف عام کو سمجھانے کی غرض سے عرف عام کی رعایت کر دی جاتی ہے اور عرف کی نظر سے حقیقت سے ہٹ کر بات کہہ دی جاتی ہے۔ اچھا یہاں حقیقت والی بات یہ ہے کہ موجود کلی دو نہیں ہیں ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے — رہا عالم تو وہ اللہ کے سوا اور اللہ سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ ہی کا ایک مرتبہ ہے اور وہ ظہوری و نمودی مرتبہ ہے جہاں پہونچ کر حضرت الوہیت خفا سے ظہور میں خمود سے نمود میں آجاتا ہے۔ ایک ہی موجود اور ایک ہی وجود ہے جس نے مرتبوں کے فرق سے دو نام اختیار کر لئے ہیں خفا و خمود کے مرتبے میں اللہ کا نام اختیار کیا ہے ظہور و نمود کے مرتبے میں عالم کا نام اختیار فرمایا ہے۔ بتایا جا چکا ہے کہ موجود اور وجود ایک ہی چیزیں ہیں اور وجود ہی وہی تعالیٰ ہے — یہ جو کہا گیا کہ ماسوائے اللہ عالم ہے تو یہ بھی تسامحی بات ہے حقیقی بات نہیں ہے ماسوائے اللہ ہے کہاں، ہر جگہ تو اللہ ہی اللہ ہے۔ ماسوائے اللہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ وجود تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے کیوں کہ اللہ عین وجود ہے موجود بوجود اور موصوف بالوجود نہیں ہے

ماسوائے اللہ کو ماننا تو شرک ہے اور اتنا بڑا شرک کہ شرک فی المعبودیت بیچارہ اس کے
سامنے پانی بھرے اتنا بڑا شرک کہ کوئی شرک اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا ——— یہاں
حقیقی بات کیا ہے؟ حقیقی بات یہ ہے کہ دنیائے حقیقت میں ماسوائے اللہ کوئی نہیں کہیں نہیں
حقیقت کی دنیا میں اللہ ہی اللہ ہے اور بس، البتہ اعتبار کی رو سے یعنی مرتبوں کے فرق
سے اللہ ہی کے دو نام ہیں، اللہ اور مخلوق اللہ یعنی عالم۔ اور اسی اعتباری فرق سے
دونوں ناموں کے احوال اور احکام جدا جدا ہو گئے ہیں ——— لیکن یہ دھوکا نہیں کھانا چاہئے
کہ اعتبار بے اعتبار چیز ہے، علم اور حقیقت کی نگاہ میں اعتبار ہی با اعتبار ہے اتنا با اعتبار
کہ حکمت کا اعتبار اسی پر قائم ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ
(اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہو جاتی) - لہذا اللہ اور عالم کا اعتباری فرق
بھی ایک وزن رکھتا ہے اور اس وزن کی قدر کو کھویا نہیں جا سکتا ——— با ایں ہمہ
حقیقت کا لحاظ بھی ضروری چیز ہے - اور اس لحاظ سے بہر حال اتنا ضروری ماننا پڑے گا کہ
عالم حضرت الوہیت کے مقابلے میں کوئی متقابل وجود نہیں ہے بلکہ متداخل وجود ہے - اور اس
حیثیت سے غور کیا جائے تو عالم بمقابلہ حضرت الوہیت وجود کے پانچویں مرتبے میں ہے پہلا
مرتبہ وجود ذات حضرت الوہیت کا پھر صفات الٰہی کا پھر شیونات الٰہی کا پھر افعال الٰہی کا تب
عالم کا اور ان مرتبوں میں سے وہ جس مرتبے کا بلاواسطہ نتیجہ ہے وہ افعال الٰہی کا مرتبہ ہے یعنی
عالم افعال الٰہی کی بدولت ظہور میں آیا اور اسی کے واسطے سے اس کو ذات حضرت الوہیت سے
نسبت ہے۔

(۳۴) عالم کی پہلی دو کلی قسم روحی عالم اور مادی عالم ہے - روحی عالم روح اور روحیات کا
مخزن ہے، مادی عالم مادہ اور مادیات کا معدن ہے - پھر انہیں دونوں سے تقسیم در تقسیم
قسمیں بے حد و حساب تک بڑھتی چلی گئی ہیں ——— عالم مجموعی حیثیت سے بھی اور افرادی حیثیت
سے بھی حادث ہے، متغیر ہے، فانی ہے مگر فانی صورتاً نہ کہ حقیقتاً - اسی طرح حادث بھی
صورتاً نہ حقیقتاً، عالم کی حقیقت تو صرف وجود ہے، وجود بھی اللہ ہے، پس اس کی حقیقت
اللہ ہے، اللہ کو کہاں فنا، پس عالم کو بھی بلحاظ حقیقت فنا نہیں - اللہ میں حدوث کیسا

حدوث تو وجود بعد عدم کا نام ہے اور اللہ کو بھلا عدم لپٹ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں نہ سابق عدم نہ لاحق عدم تب عالم کو بھی جسکی حقیقت صرف اللہ ہے عدم نہیں لپٹ سکتا سابق عدم بھی نہیں جیسا کہ لاحق عدم نہیں۔ تب عالم بھی حقیقتاً حادث نہیں ہو سکتا صرف صورتاً حادث ہو سکتا ہے۔ صورتاً حادث اور فانی ہونا یہ ہے کہ صرف ایک معیّن صورت کے علاوہ دوسری صورتوں کے سلسلے میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہیگا۔

احوالیات عالمی

(۱)۔ عالم بحیثیت مجموعی بھی اور بحیثیت اجزا کے بھی ارتقائی ہے۔ یعنے ترقی کرتا رہنے والا ہے اور تکمیلی ہے یعنے تکمیل کی آرزو اور جستجو میں ہے۔ ترقی کیا ہے کھلنا اور پھیلنا۔ تکمیل کیا ہے؟ اُس حد کو پہنچ جانا جسکے بعد کھلنا اور پھیلنا ناممکن ہو جائے خواہ محدود رنگ میں ایسا ہو —— ارتقا سفر ہے تکمیل قیام ہے؟ ارتقا مسافت چاہتا ہے تکمیل منزل ڈھونڈتی ہے۔ وہ مسافت کیا ہے جس میں عالم ارتقائی سفر کرتا رہتا ہے۔ افراد کے لئے تو یہ مسافت وہ احوالی فاصلہ ہے جو خود ان کے آپس میں بھی درمیان میں حائل ہے جس نے ادنیٰ کو ادنیٰ اور اعلیٰ کو اعلیٰ بنا رکھا ہے؟ ادنیٰ فرد اعلیٰ فرد کی طرف بڑھتا ہوا اس فاصلے کو طے کرتا رہتا ہے جو اس کے اور فرد اعلیٰ کے درمیان احوالی حیثیت میں پھیلا ہوا ہے جس نے اسکو ادنیٰ اور دوسرے کو اعلیٰ کر رکھا ہے۔ مثلاً ذرہ سورج بننے کی فکر میں ہے اور قطرہ دریا بننے کی دھن میں اور دونوں اس احوالی مسافت کو طے کرنے میں لگے ہوئے ہیں جو دونوں میں فاصلہ بنی ہوئی ہے —— مجموعے کے لئے وہ مسافت وہ احوالی فاصلہ ہے جو اسکے اور حضرت الوہیت مع لواحقات کے درمیان میں حائل ہے جس نے اسکو عالم اور حضرت الوہیت معہ لواحقات کو اللہ اور لواحق اللہ یعنی صفات اللہ، شیونات اللہ، افعال اللہ بنا رکھا ہے مجموعہ عالم یا عالم بحیثیت مجموعی حضرت الوہیت مع لواحقات بننے کی فکر میں غرق ہے اور اس سلسلے میں اس احوالی مسافت کو طے کرنے میں لگا رہتا ہے جو اسکے اور حضرت الوہیت مع لواحقات کے درمیان حائل ہے —— ارتقا اور تقاضائے ارتقا فطری ہے جو خود بخود پیدا ہے اور خود بخود کارفرما ہے۔ یہ ارتقا معہ تقاضائے ارتقا کے ناممکن الانتہا ہے یعنی ایسا ہے کہ ختم نہیں ہو سکتا مگر اسوقت جبکہ عالم خود ختم ہو جائے۔ عالم کبھی ختم نہ ہوگا بس ارتقا معہ تقاضائے ارتقا بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔ البتہ ممکن الانقطاع ہے یعنی بیچ بیچ میں ٹوٹ سکنے والا ہے اور حائل الانقطاع ہے یعنے بیچ بیچ میں واقعتاً ٹوٹتا بھی رہتا ہے کبھی موانعات کی وجہ سے کبھی درمیانی تکمیلات کی وجہ سے۔ ساتھ ہی ساتھ ذاتی الانقطاع بھی ہے

یعنی درمیانی انقطاعات اور شکستوں کو اٹھاتا اور مٹاتا بھی رہتا ہے اور اپنے پچھلے کو اپنے اگلے سے جوڑتا رہتا ہے ــــ اس ارتقا کا وجود انسانی فہم کی رو سے انسان میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ نہایت آسانی سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ ہر فرد انسانی میں محسوس حد تک موجود ہے۔ اگرچہ بعض بعض جگہ اتنا نمایاں نہیں ہے کہ آسانی سے محسوس ہو سکے اور اس لئے کم نظروں کو معدوم ہونے کا دھوکا ہو جاتا ہے، حالانکہ معدوم نہیں ہے محسوس خفی ہے ــــ یہ ارتقا کی کیفیت محمود چیز ہے یا مذموم چیز یعنی اچھی چیز ہے یا بری چیز۔ یقیناً اچھی چیز ہے، بری چیز ہونے سے اس کا کیا واسطہ۔ فطری چیز بھی کہیں بری ہو سکتی ہے۔ فطری چیز کی برائی خود فطرت کی برائی ہے فطرت کی برائی خود حضرت الوہیت کی برائی ہے، کیونکہ فطرت خود اسکی حقیقت یا حالت ہے ــــ جس طرح عالم بحیثیت مجموعی حضرت الوہیت کی طرف بڑھتا رہتا ہے افراد عالم بھی حضرت الوہیت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں با لواسطہ یا بلاواسطہ انسان بلاواسطہ اس طرف بڑھتا رہتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ تکمیل منزل ڈھونڈتی ہے ۔ تکمیل کی منزل کیا ہے، منزل ایک نہیں ہے بہتیری ہیں اور لا متناہی ہیں، تصوری آخری منزل حضرت الوہیت ہے مرتبہ ذات میں۔ اس سے پہلے کی منزلیں صفات الہی، شیونات الہی، افعال الہی اور علوی مخلوقات ہیں، علوی اس فرد کے اعتبار سے جس کی تکمیل سے بحث کی جائے ـ یہ درمیانی منزلیں کہی جائیں گی ــ پس تکمیلات بہت ہیں اور غیر متناہی ہیں۔ ہر فرد کے لئے بھی اور عالم مجموعی کے لئے بھی۔ درمیانی تکمیلات کبھی ختم نہیں ہوں گی اور آخری تکمیل خارجاً کبھی آئے گی نہیں صرف تصور میں رہے گی۔ البتہ قریب بڑھتا رہے گا۔ قرب بعید قرب قریب سے بدلتا رہے گا۔ یہ سلسلہ نامحدود مدت سے چلا آرہا ہے اور نامحدود مدت تک چلتا رہے گا۔ سلسلۂ تکمیلات جو کبھی ختم نہ ہوگا سلسلۂ وقفات ہے۔ جس کے ہر ٹکڑے پر ارتقا کا وقتی وقفہ ہے مگر تصوری وقفہ خارجی وقفہ نہیں۔

ــــــــــــــــــــــــ خود حضرت الوہیت ارتقائی ہے یا نہیں، وہ بھی ارتقائی ہے۔ ارتقا حیات ہے جمود موت، حضرت الوہیت حی ہے اور حیاتی میت اور موتی نہیں ہے۔ تب جمودی کیسے ہو سکتا ہے۔ لامحالہ ارتقائی ہے ــ البتہ اسکا ارتقا ارتقائی الی الغیر نہیں ہے ارتقائی الی نفسہ ہے۔ اس کا ارتقا غیر کی طرف نہیں ہے، بلکہ

خودی عزت ہے۔ وہ ترقی اس لئے نہیں کر رہا ہے کہ کسی مقصد کو پکڑے بغیر ہے کمال جس کو پکڑے ترقی
ہی اس لئے ہے کہ خود ہی کو پکڑے وہ خود ہی خود ہے پس اس کی نموّ کا سمت خود کے سوا اور کوئی
ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ تب وہ خود ہی ترقی کنندہ اور خود ہی سمت ترقی ہے خود مترقی یا مرتقی خودی
مترقی یا مرتقی الیہ۔ لیکن مترقی اور مترقی الیہ میں وہ فرق ہو تو جو یہاں دو لی نہیں۔ دوئی یوں
ہے کہ مترقی ہے اجمالی شان سے۔ مترقی الیہ ہے تفصیلی شان سے۔ مترقی ہے ذاتیاتی شان سے
مترقی الیہ ہے صفاتیاتی شیونیاتی افعالیاتی شان سے۔ اس کی ترقی اس کی تفصیل ہے تفصیل
ہی تخلیق ہے پس اس کی ترقی تخلیق ہے۔ اس کی ترقی کا نتیجہ مخلوق ہے اور اس کی صورت ترقی یہ عالم ہے
وہ ترقی نہ کرتا ہوتا تو خود ہی رہتا شان اجمال میں۔ عالم نہ بنتا اور عالم نہ ہوتا جو خود وہی ہے شان تفصیل
میں۔ اجمال ہی خفا ہے تفصیل ہی ظہور ہے۔ وہ خود خود ہے شان خفا میں اور خود عالم ہے شان ظہور میں
———— حضرت الوہیت کی ترقی محوی اثباتی نہیں ہے خالص اثباتی ہے۔ اس کی ترقی اس طرح
نہیں ہے کہ کچھ مٹتا ہو کچھ بنتا ہو بلکہ صرف بنتا ہی بنتا ہو۔ ذات بحیثیت اجمال بدستور قائم رہتی ہے
اور ذات بحیثیت تفصیل ثبوت پاتی رہتی ہے ———— عالم جس طرح ارتقائی ہے اور تفصیلی ہوا اسی طرح
ارتباطی بھی ہے۔ عالم مجموعی بھی حضرت الوہیت سے وابستہ یا رابطہ رکھتا ہے۔ افراد عالم حضرت الوہیت سے اور افراد آپس میں بھی
آپس میں بھی وابستہ ہیں۔ یہ رابطہ ہی ہے جس نے عالم کو قائم رکھا ہے رابطہ ختم ہو تو عالم ختم ہو جائے
———— رابطہ ہی زندگی ہے مجموعی رابطہ مجموعی زندگی، فردی رابطہ فردی زندگی۔ رابطہ کی شکست موت
مگر رابطہ کبھی شکست نہیں پاتا اس لئے موت کبھی آتی نہیں۔ عالم مجموعی حیثیت سے بھی اور
افرادی حیثیت سے بھی موت سے پاک ہے۔ اور وہ موت جو آتی نظر آتی ہے صورت زندگی ہے [illegible]
کی ایک انقلابی صورت ہے ———— عالم ہی ارتباطی نہیں ہے حضرت الوہیت بھی ارتباطی
ہے۔ وہ بھی عالم سے رابطہ رکھتا ہے جیسا کہ عالم اس سے رابطہ رکھتا ہے۔ عالم کا [illegible] رابطہ عالم کو
قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے حضرت الوہیت کا رابطہ بھی ضروری ہے دونوں رابطے مل کر عالم کو
قائم رکھتے ہیں اور زندگی دیتے ہیں ———— رابطہ ہی الوہیت کا ذریعہ ہے اور [illegible]
بھی ہے رابطہ مٹتا تو نہیں پژمردہ ہوتا ہے رابطہ کی پژمردگی [illegible]
کے لئے کافی نہیں ہے ارتقا [illegible]

بے آرامی سربرآوردہ ہوتی رہیگی اس وقت تک جب تک رابطہ شگفتہ نہ بنا لیا جائے - یہ بے اطمینانی
انسانوں میں عالمگیر ہے، ایک انسان نہیں مل سکتا جو رابطے میں شکستہ ہو اور طمانیت سے پیوستہ ہو یا بے
اطمینانی سے وابستہ ہو- اگرچہ بہتوں میں یہ بے اطمینانی کاموں کے انبار اور مشغولیتوں کے
جنون انگیز بار سے دبی ہوئی بن جاتی ہے مگر اس زندہ چنگاری کی طرح جو منوں راکھ کے نیچے دبی پڑی
ہونے پر بھی ذراسی کرید سے بھڑک کر اپنی اشتعالیت کا ثبوت دیدیتی ہے یہ دبی ہوئی بے اطمینانی بھی
سکون وسکوت کے لمحوں میں فکر کی ذراسی ٹھیس سے چمک کر خبر دیدیتی ہے کہ میں مر نہیں چکی ہوں
صرف دب گئی ہوں ـــــ اس ہمہ گیر بے اطمینانی کا ایک ہی علاج قدرت کے شفاخانے میں ہے
وہ ٹوٹے ہوئے رابطے کی وابستگی بلکہ کھلائے ہوئے رابطے کی شگفتگی ہے ـــــ پس ارتقا کے
ساتھ ساتھ ارتباط کو بھی شگفتگی اور وارفتگی کی حد تک زندہ رکھنا اور زندہ چلائے چلنا چاہیے تاکہ
علویت کے ساتھ ساتھ طمانیت کی نعمت بھی نصیب تقدیر ہے اور حرکت کے ساتھ ساتھ سکون
بھی سامان راحت بنا موجود رہا کرے ـــــ حرکت بلا سکون اسی طرح بے لطفی حیات کا سامان
ہے جیسا کہ سکونِ بے حرکت خاتمہ حیات کا عنوان ہے -

عالم کے لئے زندگی کی صراط مستقیم یہی ہے اور اس کے علاوہ زندگی کی جو راہ ہے راہِ
منحرف ہے جو چلنے کے لائق نہیں ہوتی بچنے کے لائق ہوتی ہے

ـــــ ناواقفوں نے اور نالائقوں نے رابطے کا ایک بدل بھی تجویز کیا
ہے اور اس سے لاطمانیت کا علاج چاہا ہے، یہ بدل اور علاج کیا ہے لاابالیت اور
انہماکی نفسیانیت لیکن اصولیت کے علاوہ واقفیت نے بھی روشن کر دیا ہے کہ یہ
علاج علاج نہیں ہے اضافہ بیماری ہے - پس عالم کو بھی مانو اور رابطۂ عالم کو بھی مانو
اور اس طور مانو کہ رابطہ ہی روح عالم ہے جس طرح کہ ارتقا غذاء عالم ہے - عالم تین بنیادی
چیزوں کا مجموعہ ہے - روح، مادہ، دہر (زمانہ)

روحیات

حقائقیات روحی

(۱) روح عالم کا فرد اول فرد اعلےٰ فرد اقرب فرد اقرب با
فرد اشبہ یعنی اقرب باللہ اور اشبہ باللہ ہے -

روح عالم میں سب سے پہلے پیدا کی گئی سب سے برتر پیدا کی گئی سب سے قوی تر پیدا کی گئی۔ حضرت الوہیت سے اتنی زیادہ قریب کہ اس کے برابر کوئی قریب نہیں۔ حضرت الوہیت کی اتنی موزوں شبیہہ کہ اتنی موزوں کوئی شبیہہ نہیں۔ کامل مجرد تو نہیں پھر بھی اتنی زیادہ مجرد کہ دوسرا کوئی اتنا مجرد نہیں۔ (مجرد کامل وہ ہے جو ہر کثافت حتیٰ کہ ترکیب اور تعلق مقید کی کثافت سے بھی خالی ہے) روح نہ مادیت رکھتی نہ جسامت رکھتی۔ نہ مادہ ہے نہ مادی نہ جسم ہے نہ جسمانی نہ بسیط ترین اور لطیف ترین جسم نہ مرکب جسم اور کثیف جسم۔ روح ایسی کیوں ہے اس لئے کہ بلا واسطہ ذات حضرت الوہیت سے نکلی ہے اور بلا توسط صفات حضرت الوہیت سے ٹپکی ہے۔ اس وقت کہ جب نہ مادہ پیدا ہوا تھا نہ مادیت۔ البتہ اس میں تمدی اور تجسم کی قابلیت اور مادہ و مادی اور جسم و جسمانی بن جانے کی قدرت ضرور مضمر ہے۔ چاہے تو یہ سب کچھ بن جائے اور جب چاہے بن جائے اور یہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح انسان نہ لباس ہے نہ لباسی مگر لباسی بن سکتا ہے اور جب چاہے بن جاتا ہے۔ ایک چیز جو ایک دوسری چیز کی حقیقت میں داخل نہ ہو اس کی قدرت میں داخل رہ سکتی ہے۔ روح جس طرح حضرت الوہیت کی پہلی مخلوق ہے پہلی نوبت تخلیق کی رو سے اکلوتی مخلوق بھی ہے۔

(۲) روح کا مبدء حقیقت اور مادۂ خلقت حضرت الوہیت کی صفتِ حیات ہے۔ صفت حیات ہی نے پہلی نمود اختیار کرکے روح کو نمودار کیا اور خود جامۂ روحی میں نمودار ہوئی اور اسم روح سے موسوم ہوئی۔ اسی لئے روح کائنات عالم میں مرکز حیات بن گئی۔ حیات کی تمام نہریں جو پوری کائنات عالم میں اس کے ہر رگ و ریشے میں بہتی پھرتی ہیں اسی ایک دریا (روح) سے نکلتی ہیں اور رواں ہوتی ہیں۔ مرکز حیات بھی بن گئی اور تمام لوازم حیات سے بھی مسلح ہو گئی۔ مثلاً شرکت، شعور، جذبہ، ارادہ، فعل ارادی۔ روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بات یہیں سے متعین ہو جاتی ہے۔ روح کی حقیقت حیات الٰہی کی نمود اولین ہے جب روح کی حقیقت یہ ہے تب روح کی تعریف منطقی یہ ہوگی۔ وہ وجود حیات الٰہی کی اولین نمود اور حیات کا برترین مرکز مشہور ہے۔ روح اس حقیقت اور اس تعریف کی

رو سے ذات الٰہی کی بے واسطہ مخلوق ہے۔ اگرچہ صفتِ حیات کو ضرور دخل ہے مگر
صفتِ ذات سے باہر تو ہوتی نہیں اگرچہ اعتباراً غیرِ ذات ہی، اس لئے یہ دخل واسطۂ
خارجی کو ثابت نہیں کرتا۔ اسی بے واسطگی کی طرف اشارہ ہے جہاں کہا گیا ہے کہ روح امرِ ربی
سے ہے اور حکمِ ربی سے پیدا ہوئی ہے یعنی یہ کہ روح کی خلقت میں سوا حکمِ ربی کے کسی مخلوق
کو حقیقتاً یا آلتاً مطلق دخل نہیں ہے اور کیسے دخل ہو جب روح پہلی مخلوق ہے جس کے پہلے
یا جس کے ساتھ کوئی دوسری مخلوق نہیں ——— روح میں اور حیاتِ الٰہی میں صرف
اتنا ما بعد الفرق ہے کہ حیاتِ الٰہی حیاتِ بے نمود ہے روح حیاتِ با نمود ہے۔ اسی فرق
کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ روح مشہود ہے، حیاتِ الٰہی نا مشہود ہے اور اگر مشہود ہے تو روح
کے واسطے ہی سے مشہود ہے ——— بقیہ تمام خواص و احوال میں عین حیاتِ الٰہی ہے
اور جمیع کمالاتِ حیاتِ الٰہی ہے اور اسی نا محدودیت کے ساتھ جمیع کمالاتِ حیاتِ الٰہی
ہے جس نا محدودیت کے ساتھ خود حیاتِ الٰہی جمیع کمالاتِ الٰہی ہے۔ (اگر محدودیت
ہے بھی تو اعتباری محدودیت ہے خارجی محدودیت نہیں ہے) صفتِ حیاتِ الٰہی کو دیگر
صفاتِ الٰہی کے مقابلے میں ایک خاص فضیلت بھی ہے۔ وہ یہ کہ تمام دیگر صفاتِ
الٰہی کے مقابلے میں اقرب الی الذات ہے یعنی ذاتِ الٰہی سے سب سے قریب تر اور
اس فضیلت سے وہ وسیع ترین معنی میں عین ذات کہلانے کے قابل ہے، اس فضیلت
نے اس کو ایک دوسری فضیلت بھی بخش دی ہے، وہ یہ کہ جامع جمیع صفات ہے اور
اس لئے حاکمِ جمیع صفات ہے ——— روح چونکہ صفتِ حیات ہی کا مظہرِ اول اور
مظہرِ اتم ہے اس لئے روح کو بھی یہ فضیلت وراثتاً پہنچی ہے کہ وہ حضرتِ الوہیت کی
مثالِ جامع و کامل ہے جس میں تمام صفاتِ حضرتِ الوہیت اسی طرح مجموعاً و تماماً
منعکس اور متجلی ہیں جس طرح صفتِ حیات مجموعاً و تماماً منعکس و متجلی ہے، اور اسی
جامعیت و حاکمیت کے ذریعے فضیلتِ خلیفۃ الالوہیت سے بھی مشرف ہے اور فضیلت
خلیفۃ الالوہیت کے ذریعے پوری کائناتِ عالمی اور جملہ مخلوقاتِ الٰہی پر بعد حضرتِ
الوہیت کے حاکمِ مطلق ہے۔ روح اسی فضیلتِ خلیفۃ الالوہیت کے باعث

اتنی عظیم و فخیم چیز ہے کہ عارفِ اعظم بھی اوّلین مشاہدۂ تامّہ میں اس پر حضرت الوہیت کی خود بدولت کا دھوکا کھا سکتا ہے اس کو خود حضرت الوہیت تصور کر سکتا ہے اور یوں چلا سکتا ہے کہ ان ھذا ھو ربی (یقیناً یہی میرا خدا ہے) جیسا کہ ایک عارف اعظم نے کہا تسی سال روح را با خدا پرستیدم (تیس برس تک روح کو خدا سمجھ کر پوجتا رہا ہوں) اِسی رُوح کو جسمانیت کی بہت محدود شکل میں عارفوں کے عارف اور رسولوں کے رسول نے پہلی بار دیکھا تو انتہائی وسعتِ ظرف کے باوجود بھی لرزہ براندام ہو کر رہ گئے۔ اور زملونی زملونی انی اخاف علیٰ نفسی (مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ میں اپنی جان کے لئے ڈر رہا ہوں) چلاّنے لگے ——— روح کی ایک منطقی تعریف اس کی خصوصیت خلیفۃ اللہیت کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ روح خلیفۃ اللہِ اعظم کا نام ہے ——— لیکن اس اعظمیت اور افخمیت کے باوجود حضرت الوہیت کے مقابلے میں لاشئے سے زیادہ نہیں اس لئے کہ اس غریب کا وجود تک اپنا نہیں کمالاتِ وجود بیچارے کس گنتی میں ہیں۔ جس کا وجود ہی اپنا نہ ہو وہ اپنے مرتبۂ ذات میں لاشئے نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا ——— پس اصل عظمت حضرت الوہیت ہی کے لئے مانو اور اسی کی حمد کرو البتہ خلیفۃ اللہیت کی حیثیت سے حضرت الوہیت کی طفیل میں روح کو بھی ایک چیز مانو اور بڑی چیز مانو اور حضرت الوہیت مع لواحقات ذاتی کے بعد سب سے بڑی چیز مانو اور اس صورت سے اور اس نیت سے مانو کہ وہ صفت خلیفۃ اللہیت کی رو سے تم پر اور کل کائنات پر حاکم ہے اور اس کی حاکمیت کی تمہیں اطاعت کرنی ہے اگرچہ حاکم ظلّی ہے اور حاکمیت ظلّی رکھتی ہے اور اطاعت ظلّی ہی کی مستحق ہے کیونکہ حاکمیت حقیقی اور مستحقیت اطاعتِ حقیقی حضرت الوہیت میں منحصر ہے۔

(۲۴) یہ سارا روحی افسانہ فضیلت روح کے لیے اس کی کلیّتی حیثیت میں ہے اور واضح رہے کہ اس کی جزئیتی حیثیت بھی ہے اور وہ جزئیتی حیثیت میں اس فضیلتِ کلّی کی مستحق نہیں ہے پھر بھی فضیلت کلی کی جزئی شانیں اور جزئی فضیلتیں اس کی جزئی حیثیت کے لئے بھی ہیں — یہ درجہ جزئی حیثیت میں بے شمار جزئی روحوں میں بٹا ہوا کی

اور ایک ہوتے ہوئے بھی بے شمار بن گئی جبکہ کلی حیثیت میں صرف ایک تھی —
اس بٹوارے کے سبب اس کے دو کلی نام پڑے۔ روح کلی، روح جزئی، پھر
روح جزئی کے نام کے تحت بے شماری اقسام کی وجہ سے بے شمار جزئی ناموں والی
بن گئی۔ اس کی بے شمار قسموں میں سے ایک قسم روح انسانی کہلائی — اس خاص قسم
کے اندر روح ایک عجیب کھیل کھیلی۔ اس جزئی روح میں یعنی روح انسانی میں اگرچہ
وہ آخری جزئی روح ہے اپنی پوری کلیت لئے ہوئے سما گئی اور پوری کلیت کو سمو دیا۔
اس عجیب کھیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی کلیت کی شان میں جس فضیلت کبریٰ کی مالک تھی
اس خاص جزئیت کی شان میں بھی اس فضیلت کبریٰ کی مالک بنی ہوئی نمودار ہوئی۔ فضیلت
کبریٰ کون؟ خلیفۃ اللہیت کی فضیلت۔ گویا سمندر کی شان قطرے میں سما آئی۔ لیکن ایسا
بے اصولی کے ساتھ نہیں ہوا نہ اتفاقاً و احیاناً ہوا۔ یہ اس لئے ہوا کہ یہ خاص جزئیت جمعی
جزئیت تھی جس میں ساری جزئیتیں سمٹ آئی تھیں۔ انسانیت اسی معنے میں
احسن التقویم کہی گئی کہ وہ روح کی جمعی صورت جزئی ہے۔ پس وہ حق رکھتی ہے کہ اسمیں
روح کا جمعی کمال بھی جمعی صورت ہی میں جلوہ فگن ہو۔ جمعی کمال ہی خلیفۃ اللہیت ہے اور
اس کی جمعی صورت ہی خلیفۃ اللہیت جامعہ ہے جو یا روح کلی کے لئے مخصوص ہے
یا پھر روح انسانی کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری کسی روح جزئی کو یہ منصب اعظم
نصیب نہیں۔ اسی بنا پر انسان کو بھی خصوصاً خلیفۃ اللہ کہا گیا۔ ماحصل کائنات ٹھہرایا
گیا۔ رئیس المخلوقات بتایا گیا جیسا کہ روح کلی کو ان مناصب سے ممتاز و سرفراز
جتایا گیا۔

(۴) روح۔ انسانی روح کے مرتبے میں بھی کلی اور جزئی حیثیتوں میں تقسیم یاب ہوئی
کلی حیثیت میں روح محمدی ٹھہری اور اسی حیثیت کی ایک شان میں روح آدمی کہلائی
اور قالب آدمی میں جلوہ گر ہوئی یعنی روح محمد تھا ہی روح آدمی بھی اپنی ایک خاص شان
میں چونکہ اجمالی جامعی شان تھی اور مسجود ملائک بنی اس لئے کہ یہاں بھی شان
خلیفۃ اللہیت جامعہ سے مشرف تھی اور اسی حیثیت میں مختلف نبیوں اور رسولوں میں

شیون مختلفہ میں جلوہ گر ہوتے ہوئے اور خلیفۃ اللہیت کلیہ ناقصہ کے ناقص کلی مظاہر سے کرتے ہوئے قالب محمدی میں جلوہ گر ہوئی شانِ جامعی تفصیلی میں اور یہاں خلیفۃ اللہیت کلیہ کاملہ کے کاملی مظاہراتِ کلیہ دکھانے والی ہی — جزئی حیثیت میں بے شمار ارواح عامۂ انسانی میں منقسم ہوئی اور عوامی انسانوں کے عوامی قالبوں میں جلوہ فرما ہوئی اور ان میں سے صلحا و عرفا میں خلیفۃ اللہیت جزئیہ کے جزئی مظاہر دکھانے والی ہی — یہ حقیقت روح جوہری کا ہی روح کیفی کی نہیں ہے جسکو روح حیوانی بہ معنی روحِ تجری بھی کہتے ہیں۔

احوالیاتِ روحی

(۱) روح ذاتاً مجرد ہے یعنی مادہ اور مادیات سے پاک و صاف لیکن تعلقاً مجرد نہیں ہے بلکہ ملوث ہے اس لئے کہ ملوث مادہ اور مادیات سے تعلق بستگی کرتی ہے — روح اپنی کلی حیثیت میں مادہ کلی اور جسم کلی سے تعلق بستہ بنتی ہے بہ منشا الٰہی اور بہ حکم الٰہی اور جزئی حیثیت میں اپنی جزئی شاخوں کے ذریعے جزئی مادوں اور مادیاتوں سے جو مادہ کلی اور مادیا کلیہ کی شاخیں ہیں اور ارواح جزئی کی مانند بے شمار ہیں — روح جزئی ہی حیثیت میں جزئی اجسام و جسمانیات سے بھی تعلق بستگی کرتی ہے — روح کا یہ تعلق تدبیری ہے تمکینی نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اپنے محلِ تعلق میں متمکن اور مقیم ہو جاتی ہو اور اس کی مادی چار دیواریوں میں محصور پڑی قیدی مزدور کا سا کام کرتی رہتی ہو بلکہ ایسا ہے کہ اپنے مقام میں رہ کر اپنے شعور و ادراک کے ذریعے اپنے محلِ تعلق کی مشین چلاتی رہتی ہے — روح اس تعلق کو توڑتی بھی رہتی ہے جیسا کہ جوڑتی رہتی ہے جوڑ میں زندگی ہے توڑ میں موت — لیکن کسی کی زندگی اور کسی کی موت نہ روح کی زندگی نہ روح کی موت۔ روح زندہ ضرور ہے مگر اس تعلق کے ذریعے نہیں بلکہ خود بخود اس رابطے کی مدد سے جو اس کو حضرت الوہیت کے ساتھ ربط ہے — روح مر سکتی ہی نہیں کیونکہ وہ صاحبِ حیات نہیں ہے بلکہ خود حیات ہے جسم ہی کی زندگی جسم ہی کی موت۔ جسم ہی جیتا ہے جسم ہی مرتا ہے

روح تعلق مادّی کے سبب فائدہ نقصان بھی دکھاتی ہے یا فائدہ نقصان سے بالاتر رہتی ہے۔ فائدہ نقصان سے بالاتر نہیں رہتی ہے بلکہ اس کے چکر میں پھنستی ہے اس چکر میں فائدہ اور نقصان دونوں اٹھاتی ہے یا صرف فائدہ یا صرف نقصان — دونوں اٹھاتی ہے۔ کب فائدہ کب نقصان؟ کیونکر فائدہ کیوں کر نقصان؟ کیا فائدہ کیا نقصان۔ پورا فائدہ و نقصان تو محل تعلق سے تعلق ٹوٹنے کے بعد۔ لیکن ادھورا فائدہ و نقصان تعلق کے زمانے میں بھی پہونچتا رہتا ہے — فائدہ اس ڈھنگ پر پہونچتا ہے کہ توجہ توازن کے ساتھ محل تعلق اور اپنی ذات دونوں پر رہتی ہے اور دونوں کے حقوق و فرائض ادا ہوتے رہیں۔ نقصان اس ڈھنگ پر پہونچتا ہے کہ محل متعلق میں اتنی ڈوب ہو جائے کہ اپنی ذات اور اپنی ذات کے حقوق و فرائض اشیاء فراموشی بن جائیں ——

فائدہ یہ ہے کہ محل متعلق سے جو کہ مادہ ہے یا مادّی اور جسم ہے یا جسمانی روح نئی معرفت حاصل کرتی ہے اور نئی کیفیت پیدا کر لیتی ہے گویا اس کے علم و حال میں بڑھوتری ہوتی ہے پھر فائدہ یہ ہے کہ ربوبیت کا ایک کام انجام دینے سے اپنی (ظلّی) ربیّت میں اضافے کرتی ہے اور ربیّت اصلی سے تشبہ بڑھاتی ہے پھر کتنا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک منشاء ربی کو پورا کر کے عبدیت کا حق ادا کرتی ہے اور اس خدمت کے صلے میں مالک کی طرف سے صلے پاتی ہے — نقصان یہ ہے کہ محل متعلق یعنی مادہ مادیاتی اور جسم و جسمانیاتی کی کثافتیں بھی اپنے اندر منعکس کر لیتی ہے اور اس سے مادی اور جسمانی آلائشیں اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے۔ ان کثافتوں اور آلائشوں کے سبب فطری لطافت و نزاہت کھو بیٹھتی ہے' انابت و رجعیت الی اللہ کو کمزور کر ڈالتی ہے اس سے علویت و ربانیت کو متزلزل بنا لیتی ہے۔ رابطہ الٰہی کو مضمحل کر لینا ہی نفسانیت کا سامان ہے پس نفسانیت کو بھی جگہ دے دیتی ہے۔ یہاں سے اس کے فرائض دوگونہ ہو جاتے ہیں ایک فرض حفاظت محل متعلق کا دوسرا فرض خود کو ازسر نو منزّہ و ملطّف اور علوی و ربانی بنانے کا۔ فرض کی یہ دوگونگی اس کے لئے عذابی کشمکش بن جاتی ہے' اس غریب کا یہ حال ہو جاتا ہے ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس عذاب کو ثواب سے بدلنے کی مہم بھی اس کے سر آپڑتی ہے اس کے اپنے فطری تقاضا سے آہی پڑتی ہے اور حضرت الوہیت کی عنایت خاصہ سے لاہی دی جاتی ہے۔ اس مہم کے سلسلے میں اس کو ریاضت و مجاہدہ میں بھی گھسنا پڑتا ہے۔ اس مہم تخلیصی میں جو دشواریاں پڑتی ہیں اور گرانیاں لپٹتی ہیں ان سے بعض روحیں عہدہ برآ ہو لیتی ہیں اور مہم کو کامیابی سے سر کر لیتی ہیں، وہ نجات یافتہ بن جاتی ہیں اور نجات یافتوں میں کچھ ایسی بھی نکل آتی ہیں جو اس منفی ماحصل کے ساتھ مثبت ماحصل پر بھی ہاتھ مار بیٹھتی ہیں یعنی خلیفۃ اللہیت کا منصب جلیل اڑا لیتی ہیں اور کائنات میں شہزادیاں بن جاتی ہیں اور مشیت الٰہی کی دست و بازو ہو جاتی ہیں وذلک ھو الفوز العظیم — بعض روحیں عہدہ برآ نہیں ہوتیں اور مہم کو چوپٹ کر لیتی ہیں اور اس بدبختی کے سبب ہلاک ہو جاتی ہیں۔

(۳) تعلق مادی کے ساتھ ہی ساتھ محاسبے کا دُم چھلا بھی پیچھے لگ جاتا ہے۔ تعلق مادی کے زمانے ہی سے محاسبۂ فطری شروع ہو جاتا ہے اور اپنے قدرتی تاثرات کے ساتھ جزو زندگی بنا ہوا قائم اور جاری رہتا ہے۔ اس دور میں بسا اوقات محسوس و نمایاں نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس کی موجودگی ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے اور قوی و شدید نہیں ہوتا اس لئے اس سے بے پروائی بھی برتی جاتی ہے ـــــــ تعلق مادی ٹوٹ جانے کے بعد محاسبہ اپنی پوری شدت اور کامل وضاحت کے رنگ میں نمودار ہو جاتا ہے تب کون ہے جو اس کا انکار کر سکے تب تو وہ اپنے کو مع اپنے تاثرات کے چاروناچار منوا لیتا ہے ـــــ مبارک ہے وہ روح جو اس گرفت مہلک سے اپنا دامن بچا لے جائے اور مبارک ترین ہے وہ روح جو دامن ہی نہ بچا لے جائے بلکہ خوشنودی و تقرب کی برکتیں بھی ساتھ اڑا لے جائے۔

افعالیات روحی

(۱) روح کے افعال وہی ہیں جو حضرت الوہیت کے ہیں۔ یہ بات قدرتی سی ہے۔ روح کیا چیز ہے، روح جیسا کہ بتایا جا چکا ہے خلیفۃ اللہ ہے۔ پس قدرتاً اس کے افعال وہی ہوں گے جو حضرت اللہ کے ہیں جیسا کہ اس کے اوصاف و شیونات وہی ہوں گے جو حضرت الوہیت کے ہیں۔ البتہ کچھ افعال روحی ایسے بھی ہیں جو افعال الٰہی سے الگ ہیں اور وہ نتیجہ ہیں روح کی

نشانِ مخلوقیت کا — یہ افعال زائد مثلاً یہ ہیں تعبّد (عبادت کرنا) استعانت (مدد مانگنا) جہاد للبقا (بقا کے لیے کوشش کرنا) سعی للارتقا (ترقی کی کوشش کرنا) — پہلی قسم کے افعال روحی، افعال فطری و لزومی ہوتے ہیں جن میں روح کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا نہ اُن سے پیچھا چھوڑانے پر کبھی چھوٹ سکتا ہے۔ اسی لئے وہ محاسبہ و مجازات سے فارغ ہیں۔ نہ اُن کا حساب و کتاب نہ ان پر جزا و سزا — دوسری قسم کے افعال روحی کسبی و اختیاری ہیں، وہ اختیار سے کئے بھی جا سکتے ہیں اور اختیار سے چھوڑے بھی جا سکتے ہیں یہ افعال روحی قانون محاسبہ و مجازات سے جکڑے ہوتے ہیں۔ ان کا حساب و کتاب ہوتا ہے ان پر جزا سزا ہوتی ہے — انھیں افعال کے لئے قانون ہدایت بھی اتارا جاتا ہے اور اس کی اتباعیت کی تاکید کی جاتی ہے — اس قانون کا صحیفہ جامعہ قرآن ہے۔

روح کو مذکورہ حقیقت اور ہیئت کے ساتھ مانو اور اس کے فوز و فلاح کا جو راستہ تجویز الٰہی کی رو سے مقرر ہے اس کو اور صرف اسی کو اختیار کرو پھر اس راستے پر قانونِ الٰہی کے اشاروں کے ماتحت چلنا لازمی ٹھہراؤ تاکہ فائز بن سکو خاسر نہ ہو سکو — عذاب سے بچ سکو ثواب کو لوٹ سکو۔ حیات مادّی میں خلیفۃ اللّٰہیت کے منصب جلیلہ پر قابض ہو سکو حیات روحی میں نعمتِ قربت پر قبضہ کر سکو۔

مادّیات

حقائقیات مادّی

(۱) کائناتِ خلقی میں مادّہ کا دوسرا درجہ ہے جیسا کہ روح کا پہلا درجہ ہے — مادّی بھی ذات الٰہی سے ہی برآمد ہوا جیسا کہ روح ذات الٰہی سے برآمد ہوئی — البتہ مادہ صفت قدرت کے واسطے سے برآمد ہوا جبکہ روح صفتِ حیات کے واسطے سے برآمد ہوئی — اسی لئے مادّہ بے شعور رہا جیسا کہ قدرت بے شعور ہے مگر مکمل بے شعور نہیں کیونکہ قدرت مکمل بے شعور نہیں بلکہ نیم بے شعور جیسا کہ قدرت نیم بے شعور ہے

نیم بے شعور اس معنے میں کہ شعور ہے تو مگر دبا ہوا ہے اُبھرا ہوا نہیں ہے جیسے خواب کی بے شعوری جو مکمل بے شعوری نہیں ہے نیم بے شعوری ہے ـــ قدرت بے شعور یوں ہے کہ شعور کا سرچشمہ صفات الٰہی میں ایک ہی ہے اور وہ صفت حیات ہے مکمل بے شعور کیوں نہیں ہے اس لئے کہ صفت حیات سے با تعلق رہنے کی وجہ سے شعور حیات کا کچھ پرتو تو ضرور ہی اثر اسکی ہے تب نیم باشعوری بھی ضروری ہے جیسا کہ نیم بے شعوری ضروری ہے ـــ خلاصہ یہ کہ قدرت کی طرح جو اس کا ماخذ ہے مادہ بھی نیم بے شعور نیم باشعور ہے ـــ روح کو مادہ کے مقابلے میں ایک یہ فضیلت بھی ہے کہ روح مکمل باشعور ہے جبکہ مادہ صرف نیم باشعور ہے ـــ

(۲) مادہ مادی عالم کی علت مادی ہے جیسا کہ روح علت آلی ہے ـــ حضرت الوہیت نے مادے کو بیشک بے واسطہ پیدا کیا یعنی کسی مخلوق کے واسطے کو بیچ میں نہیں رکھا مگر مادی عالم کو مادے کے واسطے ہی سے پیدا کیا جیسا کہ روح کو بے واسطہ یعنی بے واسطہ مخلوق پیدا کیا مگر روحانی عالم کو روح کے واسطے ہی سے پیدا کیا ـــ تب حضرت الوہیت کے بعد مادہ بھی مبدء خلقت ہے اور ایک عظیم ترین مبدء خلقت ہے اور اس لئے ایک عظیم ترین محترین حکمت اور معدن منفعت بھی ہے اگرچہ روح سے گھٹ کر ہے باقی پوری مادی مخلوقات میں تو سب سے بڑھ کر ہے ـــــــ پس روح کی طرح مادہ کو بھی ایک عظیم ترین مخلوق کی حیثیت سے تسلیم کرو اور اس کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ پہچاننے اور برتنے کی کوشش کرتے رہو ـ

(۳) مادہ روح سے وابستہ کیا گیا اور روح کا محمول بنایا گیا جیسے قندیل روشنی سے پھول خوشبو سے یا مملکت حکومت سے وابستہ کئے جاتے ہیں اور محمول بنائے جاتے ہیں ـ

(۴) مادہ بہ نسبت روح کے زیادہ کثیف تھا اور یہ اس لئے کہ مادہ کا مبدء صفت قدرت ہے جو بہ نسبت صفت حیات کے زیادہ کثافت رکھتی ہے کیونکہ قدرت جامد ہے حیات متحرک ہے قدرت منفعل چیز ہے حیات فاعل چیز ہے ـ دوسرے اس لئے بھی کہ روح اپنی خلقت میں ایک صفت حیات ہی کو درمیانی رکھتی ہے مادہ اپنی خلقت میں صفت حیات

کے علاوہ صفت قدرت کو بھی درمیانی رکھتا ہے۔ ایک درمیانی کے مقابلے میں دو دو درمیانی زیادہ کثافت لا سکتے ہیں — پھر بھی اپنی بساطت کی حالت میں اس قابل نہیں کہ جسمانی آنکھیں اس کو دیکھ سکیں اور پھر بھی جسم کے مقابلے میں اتنا لطیف کہ اگر وہ دکھائی دے جائے تو بڑے بڑے عارفوں کو بھی اس پر شروع شروع روح کا دھوکا ضرور ہو جائے گا اور چھوٹے چھوٹے عارفوں کو حضرت الوہیت کا بھی دھوکا ہو سکتا ہے — چنانچہ بہت سے بہت عارفوں کی تو حد پرواز بھی یہی حضرت مادہ ہیں جن تک پہونچ کر بلکہ جن کی تجلیوں کو پہونچ کر خود کو عارف باللہ واصل الی اللہ فانی فی اللہ سمجھتے ہیں اور تجلیات مادی کو تجلیات الٰہی مان کر رقص افتخار کرنے لگتے ہیں گویا رأیت ربی عیاناً (میں نے رب کو کھلم کھلا دیکھ لیا) ——— کیا عجب ہے کہ تجلی طور بھی یہی حقیقت رکھتی ہو اور شعلۂ ایمن بھی اسی قبیل سے ہو — اسی لئے کہتے پتے کی بات بعض کامل الفہم عارفوں نے کہی "ہرچہ در دیدہ در شنید آید اورا غیر حق تصور باید کرد"

(۵) مادہ اپنی اولین بسیطی حالت میں لامحدود پھیلاؤ رکھتا ہے اور بصورت خلا دکھائی دیتا ہے اور خلا کا وہم پیدا کرتا ہے۔ مادہ اس حالت میں لامتناہی صلاحیت بھی رکھتا ہے اجسام اور اشکال اختیار کرنے کی اور جسمانی اور شکلی اثرات نمودار کرنے کی جن کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جا سکتا — جو نہ آج تک محدود ہوئے ہیں نہ کبھی محدود ہوں گے۔

(۶) مادہ ہی اپنی اولین بسیطی حالت میں عرش ہے جو کہ نامحدود پھیلا ہوا ہے اور زمین آسمان اور ستاروں کو اپنے لامحدود بازوؤں میں لپیٹے ہوا ہے — حضرت الوہیت عرش کے نام سے مادہ ہی پر اس کی اولین بسیطی حالت میں مستوی اور مستولی ہوئی جب اس نے چاہا کہ مادی مخلوقات کی رچن شروع کرے اور ہنگامۂ کائنات کو کھڑا کر دے اس حیثیت سے کہ وہی اس کا کارخانۂ خلقت بھی ہے اور وہی اس کا تخت گاہ حکومت بھی ہے جس کی وسعت وسعت قدرت کا پورا ساتھ دے سکتی ہے جہاں تک مادی تخلیق کا معاملہ متعلق ہے جس کی بہ اجلال حکومت ربی کے دوش بدوش چل سکتی ہے جہاں تک مملکت مادی کا مسئلہ وابستہ ہے — پھر جب خود بدولت حضرت الوہیت ہی

اس پر جلوہ گزین ہو گئی تو روحیں کیا مجال رکھتی تھیں کہ اس کے گرد طوافانہ منڈلاتی نہ پھریں پس روحیں بھی جو ملائکہ کی اصل ہیں طواف مادّہ میں مشغول ہو گئیں

مادّہ بھی اپنی پہلی نشوی حالت میں جس کو فلسفۂ طبیعی نے اثیر کہا ہے کرسی ہے جو عرش ہی کی نشو یافتہ صورت ہے ۔ اور عرش ہی کے برابر وسعت یعنی وسعت لامحدود رکھتی ہے ۔ اگر ذات حضرت الوہیت سے نیچے اتریئے تو ذات اعلیٰ و والا کے بعد پہلے عرش پڑے گا پھر کرسی ۔ اگر نیچے عالم ارضی سے ذات اعلیٰ و والا کی طرف چلئے تو پہلے کرسی پڑے گی پھر عرش

مادّہ ہونے کی اوّلین نشوی شکل اثیر ہے اور آخری شکل انسان اسی لئے مادی دنیا میں وسعت سب سے زیادہ اثیر میں ہے اور صلاحیت سب سے زیادہ انسان میں مادّہ ہی اسی کی حیثیت میں ان چار بڑی قسموں میں بانٹا گیا ہے ۔ عرش، کرسی، سما، ارض پہلی تین قسمیں وسعت اور صلاحیت دونوں لحاظ سے بہت بڑی ہیں اتنی بڑی کہ ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ــــ ارض وسعت کے لحاظ سے تو کچھ بھی بڑی نہیں ہے بہت چھوٹی ہے مگر صلاحیت کے لحاظ سے بڑی اور بہت بڑی ہے یہاں تک کہ عرش سے چشمک کرتی ــــ پر مادّہ سما نے دائرے میں سات بڑے حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے ۔ ان حصوں میں کا ایک حصہ وہ ہے جو زمین کے نزدیک ہے اور اسی مناسبت سے اس کو سماء دنیا (نزدیک والا آسمان) کہا گیا ۔ اسی طرح زمین کو بھی سات طبقوں میں بانٹ دیا گیا ــــ دوسرے کواکب بھی زمین کی طرح مادّہ ہی کی صورتیں ہیں اور بڑی بڑی اہمیتیں رکھتے ہیں جن کی نہ تعداد معلوم ہے نہ اہمیتوں ہی کا پورا انکشاف ہوا ہے صرف چند ہیں جن کی اہمیتوں کا ایک حصہ منکشف ہوا ہے اور کئی حصے ہنوز پردۂ غیب میں ہیں ۔ ان میں سے سات زیادہ مشہور ہیں چاند، سورج، مشتری، زہرہ، مریخ، عطارد، زحل ــــ مادہ عرش تک صرف مادّہ کہلاتا ہے اس کے بعد جسم کہلانے لگتا ہے کیونکہ اس کے یہاں اس نے نشوی حالت اختیار کر لی اور بساطت سے نکل کر ترکیب کی حالت میں آ گیا ۔

احوالیاتِ مادّی

دو مادّہ شروع ہی حالت میں بسیط محض رہتا ہے پھر ترکیب اختیار کر لیتا ہے اور حالت تجسّم میں آجاتا ہے' پہلے لطیف تجسّم اختیار کرتا ہے پھر کثیف تجسّم اختیار کرتا ہے اور لطیف جسم اور کثیف جسم کی دو قسم میں منقسم ہو جاتا ہے پہلے اثیر بنتا ہے پھر غاز بنتا ہے پھر کوکب بنتا ہے پھر عنصر بسیط بنتا ہے پھر عنصر مرکب بنتا ہے' پھر غیر نامی جسم عنصری بنتا ہے اور جماد کہلاتا ہے' پھر غیر متحرک نامی جسم عنصری بنتا ہے اور نباتات کہلاتا ہے' پھر متحرک غیر مدرک نامی جسم عنصری بنتا ہے اور حیوان کہلاتا ہے' پھر مدرک جسم عنصری بنتا ہے اور انسان کہلاتا ہے۔

(۲) مادّہ ان تغیرات و انقلابات کو خود بخود نہیں اختیار کرتا بلکہ ارادہ الٰہی اور عمل روحی کی تحریک سے اختیار کرتا ہے۔ صلاحیت اس کی اپنی ہے جو قدرت الٰہی کی صلاحیت نا پائیدہ کا عکس ہے صلاحیت پائیدہ کی صورت میں ارادہ ذات حضرت الوہیت کا ہے عمل روح کا ہے۔

(۳) مادّہ بھی ارتقائی اور تکمیلی ہے ترقی کرتا ہے اور تکمیل تک پہونچتا ہے۔ ترقی کی پہلی منزل میں روح بنتا ہے دوسری منزل میں صفت قدرت کا سہارا لیتے ہوئے صفت حیات بنتا ہو تیسری منزل میں ذات ربی میں داخل ہو جاتا ہے اور حالت ادغام و اندماج اختیار کر لیتا ہے۔ یہ مادّہ کا ارتقائی سفر ہے۔ پھر تنزلی سفر اختیار کرتا ہے اور وہیں پہونچ جاتا ہے درجہ بدرجہ جہاں سے چلا تھا یعنی مادّہ بن جاتا ہے

مادّہ کا یہ ارتقا' فوقانی ارتقا ہے۔ اس کے علاوہ تحتانی ارتقا بھی رکھتا ہے۔ تحتانی ارتقا جیسا کہ بتایا جا چکا ہے انسان تک پہونچتا ہے۔ یہ دونوں ارتقائی حرکتیں متحد الزمان مختلف السمت ہوتی ہیں' دونوں کا زمانہ ایک ہوتا ہے' سمتیں مختلف ہوتی ہیں۔ تنزلی حرکتیں بھی دو ہیں فوقانی اور تحتانی۔ فوقانی تنزل وہ ہے جو انسان کی تحلیل سے شروع ہو کر مادّہ بسیط پر ختم ہوتا ہے۔ تحتانی تنزل وہ ہے جو صفت قدرت سے چل کر مادہ بسیط پر منتہی ہوتا ہے۔

دہریات

(زمانیات)

حقائقیات دہری

دہر (زمانہ) کائنات کی تین بنیادوں میں سے ایک ہے۔ دہر سما کی طرح مادّی نہیں ہے نہ روحی ہی ہے۔ دہر حقیقی وجود ہی نہیں رکھتا اس لئے حقیقی موجودات سے ماخوذ کیوں کر ہو سکتا ہے پس نہ مادہ سے نکلا ہے نہ روح سے نہ عین حضرت الوہیت ہی سے۔ صرف اعتباری وجود رکھتا ہے اور اعتبارِ مشیت سے پیدا ہے۔ نقشہ یہ ہے کہ مشیت الٰہی نہ تھی اور ہوئی۔ ہو کر تعین پذیر ہوئی تعین کے ساتھ تسلسل بھی آیا۔ مشیت الٰہی ذی تعین بھی ہوئی مسلسل بھی ہوئی۔ مشیت کا یہی تعین اور تسلسل مخلوق کی نسبت اسی المشیت کے لحاظ کے ساتھ دہر کہلایا۔ تعین اور تسلسل اعتباری ہے۔ نسبت اعتباری ہے۔ جو چیز اعتباریات سے پیدا ہے وہ لازماً اعتباری ہے —— دہر (زمانہ) تین ٹکڑے اعتباری ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلا ٹکڑا جو جسمانی خلقت کے شروع سے پہلے گذرا ازل کہلاتا ہے۔ آخری ٹکڑا جو جسمانی خلقت کے خاتمے کے بعد ہوگا ابد کہلاتا ہے۔ درمیانی ٹکڑا حین، وقت، مدت کہلاتا ہے۔ نظام شمسی کا پیدا کیا ہوا ٹکڑا عالم یعنی دن، ہفتہ، مہینہ، سال، صدی، الف کہلانے لگا۔ ازل و ابد میں شمسی زمانوں کے حسابوں کا شمار نہیں گذرتا ہیں۔ وہ ایام اللہ ہیں ان کے حسابات انسانوں کے پاس نہیں ہیں۔

جسمانیات

حقائقیات جسمانی

(۱) جسم مادہ ہی کا بچہ ہے۔ مادہ ہی کی نشوی حالت اور ترکیبی کیفیت۔ مگر اس کی اہمیت اپنی جگہ مستقل ہے اور مرکب دینا کے لئے حد سے زیادہ ہے۔ مکان مٹی پتھر لکڑی وغیرہ انہیں عناصر کا مرکب ہے لیکن پرستارِ ترکیب انسان کے لئے جو مکان کا قیدی بن چکا ہے مکان کی اہمیت

جتنی ہے وہ معلوم ہے ———— تب مادہ کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی علیحدہ اہمیت کے ساتھ ساتھ تسلیم کرو اور اس کی اہمیتوں کو پہچانو اور برتو — جس طرح مادہ کی اہمیت یوں ہے کہ مادہ نہ ہوتا تو روح بیکار تھی اسی طرح جسم کی اہمیت یوں ہے کہ جسم نہ ہوتا تو مادہ بے نتیجہ تھا۔

(۲) جسم دو قسم کا ہوتا ہے بسیط اور مرکب۔ بسیط وہ جو اپنے اندر کوئی جسم نہیں رکھتا مرکب وہ جو کوئی جسم رکھتا ہے — جسم اثیری اور عنصری کی دو قسم ہی رکھتا ہے اثیری جسم جس کو مثالی جسم بھی کہہ دیا گیا ہے وہ ہے جو اثیریت محض کے درجے میں تیار ہو جاتا ہے اور اتنا لطیف ہوتا ہے کہ عنصری آنکھیں اس کو دیکھ ہی نہیں سکتیں صرف اثیری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور عنصری اس وقت دیکھ سکتی ہیں جب اثیریت ان میں حلول کر جائے ———— اثیری جسم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک غازیاتی جو گری اور جلن کا خزانہ ہے اسی غازیاتی جسم کا ایک نمونہ جہنم ہے دوسرا نوریاتی۔ اسی نوریاتی جسم کا ایک نمونہ جنت ہے۔ جنت اور جہنم چونکہ اثیری ہیں اسی لئے عنصری آنکھیں انھیں نہیں دیکھتیں جس طرح خود اثیر عنصری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا لیکن وہ عنصری آنکھیں انھیں دیکھتی ہیں جنھوں نے اثیری نگاہ پیدا کر لیا ہے۔

(۳) عنصری جسمانی دنیا میں سب سے اہم جسم سیارے ہیں، دوسرے کواکب کے ساتھ اور ان میں اہم ترین جسم زمین ہے انسانی نقطۂ نظر سے انسانی قیام گاہ اور انسانیت کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے ———— اثیری جسمانی دنیا میں سب سے اہم جسم ملائکہ ہیں پھر سمٰوات ہیں، پھر جنت اور جہنم ہیں۔ اجنہ بھی اسی دنیا کی مخلوق ہیں اور کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔

احوالیات جسمانی

(۱) جسم روح کا معمول ہے اور اسی کے زیر حفاظت محفوظ اور اسی کی تحریک سے عامل ہے۔ لیکن روح کے وسیلے سے مشیت الٰہی اور ربوبیت الٰہی کے بھی ماتحت ہے اور یوں علت العلل اور محرک المحرکات مشیت الٰہی اور ربوبیت الٰہی بھی ہے وہ نہ ہو تو بے چاری روح خود کس شمار و قطار میں ہے اور اس کا ارادہ اور عمل کس شمار و قطار میں ہے ————

اگر آگ جلاتی ہے ہوا طراوت بخشتی ہے پانی سیرابی پہونچاتا ہے روشنی اجالتی ہے
مٹی اگاتی ہے تو یہ سب کچھ ان روحوں کی تحریک سے ہوتا ہے جو ان جسموں پر مسلط کردی
گئی ہیں۔ روحیں ہی ہیں جو ان کی فطرتوں کو ابھارتی ہیں اور ان سے کام لیتی ہیں ـــــ
فطرت بھی عمل کرتی ہے مگر فطرت کا عمل محرکانہ نہیں ہے متحرکانہ ہے محرکانہ عمل صرف روح
کا ہے۔

(۲) جسم عموماً تو مطابق فطرت ہی کام کرتا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی خلاف فطرت کام بھی کر بیٹھتا ہے یہ کب ہوتا ہے یہ تب ہوتا ہے جب روح اپنی تحریک عادی کو کھینچ لیتی ہے اور یہ کب ہوتا ہے جب مشیئت الٰہی اپنی تحریک عادی کو کھینچ لیتی ہے اور کوئی نئی خصوصی جاری فرمادیتی ہے ـــ ایسا کیوں ہوتا ہے کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ مشیئت الٰہی ایک خاص حکمت الٰہی اور خاص دستور الٰہی کے ماتحت اپنی اصلیت الاصلیات کو نمایاں کرنا چاہتی ہے اور یہ جتانا چاہتی ہے کہ عالم کی باگ بظاہر کسی ہاتھ میں ہو در حقیقت صرف ہمارے ہاتھ میں ہے ـــ یہ کیوں یہ اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ فطرت کی عاملیت مسلسل اور تاثیر عمل کو دیکھتے دیکھتے انسان مشیئت الٰہی کی عاملیت حقیقی کو فراموش کر بیٹھے اور اس سے بدعقیدگی اور روگردانی کرے اور یوں راہ سعادت سے بھٹک جائے ـــــ ایسی صورت کو خرق عادت کہا گیا ہے ـــــــــ کبھی یوں ہوتا ہے کہ مشیئت الٰہی نظام عادی میں کوئی انقلاب چاہتی ہے خواہ کلی انقلاب جس کو قیامت یا نمونہ قیامت کہا گیا ہے خواہ جزئی انقلاب جس کو کبھی آفت سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی حکمت ماورا کے نام سے پکارا گیا ہے۔

ملکیات

حقائقیات ملائکہ

(۱) ملائکہ پر بھی ایمان لاؤ جیسا کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ ملائکہ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے جیسا کہ اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایسا کیوں ہے اس لئے کہ ملائکہ آلات الٰہی ہیں افعال الٰہی کے لئے مخلوقات الٰہی میں یعنی مشیئت الٰہی یوں قائم ہے کہ ذات حضرت الوہیت مخلوقات الٰہی میں اپنے تمام ربوبیتی اور تدبیری کام ملائکہ کے

ذریعے ہی انجام دیتی ہے اس لئے ملائکہ آلات الٰہی کہلا سکتے ہیں ۔ ملائکہ سے انکار کرنا آلات الٰہی سے انکار کرنے اور نظام الٰہی سے انکار کرنے کے برابر ہے ـــــ ملائکہ مادّہ اور روح کے ترکیبی نتیجے ہیں ۔ مادّہ اور روح مل کر مرکب ہوئے تو ملائکہ پیدا ہوئے ـــــ جو مادّہ ملائکہ کے خمیر کے کام آیا جس سے ملائکہ کے قوالب تیار ہوئے وہ نوریاتی شاخ کا مادّہ ہے جبکہ کواکب کا مادّۂ خمیری، غازیاتی شاخ کا مادہ ہے ـــ ملائکہ کے موادِ جسمانی مادّۂ کلی کی شاخیں ہیں جن کو انوار کہا جاتا ہے، ملائکہ کی ارواح روحِ کلّی کی شاخیں ہیں ـــ ملائکہ کے اجسام نوری اجسام ہیں اس لئے انتہائی تیز رو، انتہائی تیز عمل، انتہائی تیز اثر ہیں ۔ ملائکہ کی روحیں روحِ کلی کی شاخیں ہیں ۔

(۲) ملائکہ تدبیرِ الٰہی کے ماتحت منتظمِ کائنات مقرر کئے گئے مقررہ ضابطۂ انتظام کے ساتھ جس کی کامل نگہداشت کے ساتھ ملائکہ انتظامِ کائنات میں مشغول ہیں بغیر ادنےٰ بے پروائی کے اور بغیر ذرہ روگردانی کے ـــ ملائکہ استعدادِ نفسانیت سے اور صلاحیت عصیانیت سے بالکل خالی رکھے گئے اور اس لئے عصیان و عدوان سے بالکل پاک رہتے ہیں البتہ ایک خصوصی حکمتِ الٰہی کے ماتحت جو یہ تھی کہ انسان کی حیثیت ..... فضیلت واضح اور مبرہن ہو جائے اور ملائکہ کی معصومیت و برتر بلندی انسان کے احساس کمتری کا سبب نہ بن جائے ۔ نمونے کے طور پر دو ملکوں کو جذبہ نفسانیت دے کر اور عالمِ انسانی میں معرضِ امتحان میں لا کر عصیان آلود دکھا دیا گیا ۔ یہ دو ملک ہاروت، ماروت کے نام سے موسوم ہیں جو بابل اتارے گئے جو حکمتِ انسانی کا پہلا بلدۃ الحرام اور مرکزِ اہتمام تھا ۔

احوالیاتِ ملائکی

(۱) ملائکہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں دو گروہ نہایت اہم ہیں عرشیین اور ارضیین عرش والے اور زمین والے، عرشیین عرش یعنی مادّۂ کلی کی خدمت پر مامور ہیں ۔ ارضیین ارض یعنی زمین کی خدمت پر مقرر ہیں ۔ ان دونوں کے بیچ میں بہتیرے دوسرے گروہ ہیں ۔ ان درمیانی گروہوں میں سے دو گروہ یہ ہیں جو جنت اور جہنم پر مامور ہیں ۔

(۲) ملائکہ ارضی کا ایک گروہ انسانی انتظام کے لئے مخصوص ہے ۔ اسی گروہ کی ایک شاخ

وہ ہے جو رجال الغیب کے نام سے مشہور ہے اسی شاخ کا ایک فرد عظیم خضر کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ یہی گروہ مقدس لڑائیوں میں مقدسین کی مدد کے لئے شرکت کرتا ہے جیسا کہ غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔

(۳۴) ملائکہ سمائی ہوں خواہ ارضی عنفری نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔ البتہ اگر وہ خود چاہیں تو رُو در رُو ہو سکتے ہیں اور ضرورت کے وقت ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ جنھیں اثیری نگاہ حاصل ہے خواہ مجاہدہ و ریاضت روحانی کے ذریعے خواہ فطری استعداد اثیریت کے واسطے سے ان کا مشاہدہ بطور معاملۂ روزمرہ کے کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کتنے قیمتی ہیں یہ لوگ کثّر اللہ امثالھم۔

سمائیات (فضائیات و مکانیات)

حقائقیاتِ سمائی

سما۔ فضا کا دوسرا نام ہے۔ سما لامحدود ہے۔ سما نہ تو خلا ہے۔ خلا محال ہے۔ جس کو تم غلطی سے خلا سمجھتے ہو خلا نہیں ہے ملا ہے یعنی بھری ہوئی جگہ۔ بھرنے والی چیز چونکہ اتنی لطیف ہے کہ اس کو دیکھا نہیں جا سکتا اس لئے سما خلا دکھائی دیتا ہے۔ بھرنے والی چیز کیا ہے۔ اثیر کہیں کہیں اثیر ہوا کی شکل میں بھی ہے۔ سما۔ مادہ ہی کی ایک شکل ہے جو اثیر سے تیار ہوتی ہے یعنی سما مادی ہے۔ لامکان کا تخیل غلط ہے۔ سما مکان ہے۔ اور سما لامحدود ہے پس مکان لامحدود ہے۔ تب لامکان کیسا۔ سما ہی کے ٹکڑے سمٰوٰت و افلاک ہیں۔ افلاک چھوٹے سے سمٰوٰت بڑے حصے۔ کواکب سما ہی میں تیر رہے ہیں۔ سما طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔

احوالیاتِ سمائی

سما ساکن و ساکت نہیں ہے متحرک و متموّج ہے۔ سما اثیر ہے اثیر متحرک و متموّج ہے۔ سما حضرت الوہیت کا سب سے بڑا نمودی نشان ہے اور حسی برہان ہے جو حضرت الوہیت کی بے نہایتی کو پکار پکار کر جتاتا ہے اور دیکھنے والوں کو وجد میں لاتا ہے۔ سما لامتناہی ہوتے ہوئے بھی حضرت الوہیت کے اندر ہی ہے۔ سما صرف امتداداً لامتناہی ہے استعداداً لامتناہی نہیں ہے۔

حضرت الوہیت استعداد لا متناہی ہے۔ جب ہی تو بے امتداد ہوتے ہوئے بھی سما جیسے لا متناہی امتداد کو اپنے اندر سے نکال کھڑا کیا ــــ سما قائم بالذات ہے مکانی حیثیت سے تب امکانی کائنات کے اندر وہ کسی ٹیک کا محتاج نہیں ہے نہ کسی سہارے کا حاجت مند ہے خود مظروف ہے خود ظرف، خود مکین ہے خود مکان۔ اس میں ساری مکانی چیزیں قیام کرتی ہیں وہ کسی مکان میں قیام نہیں کرتا ــــ سما عرش کے اندر ضرور ہے مگر عرش مکان نہیں ہے عرش تو مادّہ ہے اولین حالت میں جو مکان کی حیثیت نہیں رکھتا مکان کچھ نہ کچھ تشخصات چاہتا ہے مادہ تشخصات نہیں رکھتا صرف امتدادیت رکھتا ہے ــ سما ہی وہ مکان بھی ہے جو زمان کے مانند عالم امکان کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ سما کا بھی اعتقاد رکھو۔

فلکیات

کواکبیات

حقائقیات کواکبی

(۱) کواکب کی عظمت اور کارآمدگی پر بھی اعتقاد رکھو اس حیثیت سے بھی کہ وہ عالم ارضی اور دنیائے انسانی پر گہرا اثر رکھتے ہیں اور باامر الٰہی انکی خدمات مفوضہ انجام دیتے رہتے ہیں اس ضابطہ الٰہی فطری کے مطابق جو ان کی خدمتوں کے لیے نظم الٰہی و تدبیر الٰہی کی طرف سے مقرر کر دیا گیا ہے۔

(۲) کواکب مادے ہی سے بنتے ہیں اس کی غازیاتی شاخ سے اور ارواح کواکبی کی نگرانی میں حفظ الٰہی کے باعث قائم اور فعال رہتے ہیں۔

احوالیات کواکبی

(۱) کواکب شمار و حساب سے باہر ہیں۔ لیکن ان میں کے مشہور سات جو سیارہ سبعہ کہلاتے ہیں مع بعض تو تحقیق سیاروں کے زیادہ اہم ہیں عالم ارضی کے لیئے اور ان میں سے دو انتہائی اہم ہیں شمس اور قمر۔ شمس زندگی ارضی کا سرچشمہ ہے۔ قمر بالیدگی ارضی کا خزانہ ہے۔ ان دونوں کی معرفت اور معمولیت انسان کی مہمات زندگی میں سے ایک خاص اہم ہے اور اس لیئے وہ علم بھی جو اس مہم کے لیئے مددگار ہے یعنی علم الکواکب جو علم الہیئت کے نام سے شہرت رکھتا ہے علوم انسانی

میں خاص اہمیت رکھتا ہے جیسا کہ علم الملائکہ۔ علم الارواح۔ علم المادہ۔ علم الالسیات علم الارض علم الجمادات۔ علم النباتات۔ علم الحیوانات۔ علم الانسان خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(۲) ہر کوکب عظیم اپنا ایک فلک رکھتا ہے جس میں وہ اپنے کواکب توابع کے ساتھ حرکت دورانی برتتا ہے اور اپنا عمل ودخل صادر کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کوکب ارضی اپنا ایک فلک خاص رکھتا ہے جس میں سیاری ودورانی کرتا رہتا ہے۔ جو ابو الکواکب شمس سے پیدا ہوا اور ایک مدت تک تو پرکالۂ آتش بنا ہوا صرف دہکتا اور بھڑکتا رہا لیکن ایک مدت بعد سطح سے ٹھنڈا ہونا شروع ہوا اور ٹھنڈا ہو گیا اور اس وقت اس قابل بنا کہ روئیدگیوں اور زندگیوں کو اپنے اوپر اجازت قیام دے۔ چنانچہ روئیدگیاں اور زندگیاں سرسبز ہوں اور وہ پیدا ہوئیں اور اس سے یہ آتشیں ویرانہ بہاریں نگارخانہ بن گیا جس حیثیت میں آج ہماری نگاہیں اسکو دیکھتی ہیں اور وجد کرتی ہیں۔ اس انقلاب سے وہ روشنی سے قدرے محروم ہو گیا مگر صرف ذاتی روشنی سے اور اس کی جگہ مستعاری روشنی سے حضرت شمس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ مستعار اس کو ملنے لگی اور اس روشنی سے اس کے قرار یافتہ موالید ثلاثہ (جمادات نباتات حیوانات) اپنی ضروریات [illegible] بقائی وارتقائی پورے [illegible] اس کی سطح ٹھنڈی مگر قعر ہنوز سوزاں اور بریاں ہے یعنی جلتا ہوا اور پکھلتا ہوا۔

عنصریات

حقائقیات عناصری

(۱) عناصر پر بھی اعتقاد رکھو اس حیثیت سے کہ افلاک و کواکب کی طرح وہ بھی اساسیات عالم میں سے ہیں اور اس حیثیت سے بھی کہ انھیں سے وہ عالم خاص تیار ہوتا ہے جو عالم مقصود ہے یعنی عالم انسانی۔ عناصر کواکب کے مقابلات حقیر سہی مگر انسان کے واسطے سے نہ صرف یہ کہ حقیر نہیں ہوئے بلکہ کواکب کے مقابلے میں بھی عظیم وکبیر ہو گئے۔

(۲) عناصر چار ہیں، پانی، مٹی، ہوا، آگ۔ نئی تحقیق نے بیشک انھیں عناصر سے نکال باہر کیا ہے اس وجہ سے کہ یہ مرکب ثابت ہو گئے ہیں اور عناصر مرکب نہیں بسیط ہوتے ہیں۔

پھر ان کی جگہ پر نئی تحقیق نے دوسرے عناصر ڈھونڈ نکالے ہیں جن کی تعداد پچاسوں تک پہنچ گئی ہے۔ پھر بھی جس خاص معنی میں یہ چاروں اساسیات عناصر کہے گئے تھے اس معنے میں آج بھی باقی ہیں۔ اس خاص معنے میں عنصر وہ ہے جو محسوس اجسام سے ترکیب یافتہ ہو اگرچہ غیر محسوس اجسام سے ہو۔ یہ چاروں چیزیں محسوس اجسام سے آج بھی مرکب نہیں ثابت کی جا سکتی ہیں ـــ عناصر اربعہ میں سے دو، ہوا اور آگ اپنی اصلی شانوں میں لطیف ترین مادّیات میں سے ہیں اتنی لطیف کہ انھیں بلا تردد اثیری کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ ظاہری نگاہوں سے دیکھے نہیں جا سکتے ـــ دوسرے دو پانی اور مٹی البتہ بظاہر اثیری نہیں معلوم ہوتے لیکن ہونا چاہئے۔ کیا عجب کہ ہوں بھی جہاں کہیں اصلی شانوں میں پائے جاتے ہوں۔ اور اگر میری نگاہ اثیری پر بھروسہ کیا جا سکتا ہو تو میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ ہیں بھی ایسے ہی ـــ میری نگاہ اثیری نے انھیں شان اصلی میں دیکھا ہے اور اتنا ہی لطیف دیکھا ہے کہ ان کی اثیریت مجھ پر ذرا مشکوک نہیں رہی۔ اور اس نے مجھ پر یہ بھی ثابت کر دیا کہ نئی تحقیق کا انکار ان کی شان عنصریت سے اس کی کم نظری ہی کا نتیجہ ہے۔

(۳) عناصر اربعہ سے مرکبات عنصری بھی بنتے ہیں اور وہ عموماً وہی ہیں جو مرکبات اربعہ اور موالید ثلاثہ (جمادات، نباتات، حیوانات) کہلاتے ہیں ـــ لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ مخلوقات عنصری ہیں اور ان میں سے بعض ایسی ہیں جو بجائے چاروں کے صرف ایک سے برآمد ہوئی ہیں۔ مثلاً اجنّہ (جنّیین) کہ وہ صرف آگ سے بنے ہیں یا کم سے کم آگ کے غالب ترین جزو سے بنے ہیں اور اس غلبے کی وجہ سے ان کی ماہیت ترکیبی کو خالص آتشی کہہ دیا گیا ہے ـــ انسان انھیں مرکبات اربعہ عنصری مخلوقات میں سے ہے جس میں چاروں عنصر شریک ہیں اور ہو سکتا ہے بلکہ ہے کہ ان پرانے عناصر اربعہ کے ساتھ نو تحقیق نئے عناصر بھی شامل ہیں۔

موالیدیات (جماد، نبات، حیوان)

حقائقیاتِ موالیدی

(۱) موالید ثلاثہ پر بھی اعتقاد رکھو اس معنے میں کہ تمام تر کار آمد چیزیں ہیں انسان کے لئے خصوصاً اور پوری تین

کے لیئے عموماً اور اس لئے کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

(۴) موالید ثلاثہ بھی ذی روح ہیں اس بنیادی اصول کے مطابق کہ پورا مادّی عالم بہ حیثیت مجموعی بھی اور بہ حیثیت اجزائی بھی ذی روح ہے یعنی عالم کی ہر مخلوق خواہ ذی روح سمجھی جاتی ہو خواہ نہ سمجھی جاتی ہو ذی روح ہے۔ یہ اس لئے کہ خود مادّہ جو مادّی عالم کی جڑ ہے جس سے تمام مادّی چیزیں نکلی ہیں، ذی روح ہے ـــ حیوانی روح کے لحاظ سے نہیں کہ وہ تو حیوانات سے مخصوص ہے مجرّد روح کے لحاظ سے جو عالمگیر ہے۔ اگرچہ ان کی روحیں اپنی تاثیرات کے لحاظ سے نمایاں نہیں ہیں جیسا کہ انسان میں ہیں بلکہ دبی ہوئی ہیں مگر ہیں ضرور اور بعض اوقات نمایاں بھی ہو جاتی ہیں جب کوئی قوت اعجازی انھیں نمایاں کر دیتی ہے جیسا کہ بارہا قوت اعجازی محمدیؐ نے یہ کرشمہ دکھایا جبکہ اس نے کنکریوں کی دبی روح کو اُبھارا اور انھیں بہ حیثیت خلیفہ اللہ کے حکم دیا کہ تم رسالت محمدیؐ کی گواہی دو اس کے منکروں کے سامنے اور انھوں نے اس حکم کے سامنے سر جھکا کر گواہی دی ان لفظوں میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اور جب کہ اس نے درختوں کی دبی روح کو ابھارا اور انھیں بہ حیثیت خلیفہ اللہ کے حکم دیا کہ حرکت کرو اور اپنی جگہ سے اکھڑ کر جناب محمدیؐ میں حاضری دو اور تعظیم و تحیّت کے سجدے ادا کرو اور انھوں نے ایسا ہی کیا اور جب زمین کو حکم دیا کہ اپنی دبی رُوح کو نمایاں کرکے ذی شعور بن جا اور میرا پیچھا کرنے والے سراقہ بن جعشم کو اپنے اندر دھنسا لے اور اس نے ایسا ہی کیا اور جب ایک قدح یا گھڑے کے پانی کو حکم دیا کہ تو اپنی دبی روح کو نمایاں کرکے پھیل جا اتنا پھیل جا کہ پوری جماعت سب تجھے پی کر آسودہ ہو جائے اور اس نے ایسا ہی کیا اور ایسے ہزاروں کرشمے ـــــ مادّہ اس لیئے ذی روح ہے کہ مادّہ بھی ذاتِ حضرت الوہیّت سے ہی نکلا ہے جو سراپا روح اور سرتاپا حیات ہے، اگرچہ صفتِ قدرت کے راستے سے نکلا ہے، گر صفتِ قدرت صفتِ حیات سے جو روح کا منبع و مخرج ہے کب غیر متاثر اور غیر مقتبس ہے ـــــ اس بات کو یوں بھی سمجھو کہ اگر مادہ غیر ذی روح ہوتا تو مادّیات میں سے حیوانات اور انسانوں میں روح کیوں کر آ جاتی۔ کیا یہ غیر فطری اور غیر متوازن بات نہیں ہے کہ اصل الاصول سے تو روح کا کوئی تعلق نہ ہوا و فروع و شعوب سے یکایک متعلق ہو جائے۔

ایسا ماننا نظام کائنات کو لا اصولیانہ و لاابالیانہ ماننا ہے اور نظام کائنات ہی کو نہیں خود خالق کائنات کو بھی لا اصولیانہ اور لاابالیانہ ماننا ہے۔ پس جب کہ روح حادثات کے کچھ افراد مثلاً حیوان انسان، ملائکہ سے متعلق ہوئی تو بالکل یقینی اور لازمی ہے کہ خود مادہ سے بھی متعلق ہو اور جب مادہ سے متعلق ہونا یقینی ہوا تو یہ بھی لازمی اور یقینی ہے کہ اس کی تمام شاخوں اور تمام شکلوں سے بھی متعلق ہو۔ تب تمام موالید ثلاثہ سے بھی اس کا تعلق یقینی ہوا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مادہ کی ایک صنف حیوان سے جس میں انسان کی نوع بھی شامل ہے روح تعلق پیدا کرے اور اس کی دوسری صنف جماد اور تیسری صنف نبات سے بے پروائی رکھے۔

(۴۳) موالید ثلاثہ میں حیوان پچھلا ہے اور اشرف ہے۔ نبات بچلا ہے اور اوسط ہے۔ جماد پہلا ہے اور ادنٰی ہے۔ اسی طرح حیوانوں میں انسان پچھلا ہے اور اشرف ہے۔

(۴۴) موالید ثلاثہ آپس میں ارتقائیت کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور استقلالیت کی شان بھی رکھتے ہیں یعنی یہ بھی ہوا کہ پچھلا مولود پہلے مولود ہی سے اس کی ارتقائی صورت میں برآمد ہوا یعنی جماد ہی نبات بنا، نبات ہی حیوان ہے انسان مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوا کہ پچھلے کی تولید میں تربیت ربی نے دخل کر کے اس کو ترقی یافتہ بننے میں مدد دی۔ مثلاً نبات کا تولد جماد ہی سے ہوا مگر اس طرح ہوا کہ ایک طرف جماد ترقی کرتا ہوا نباتی صورت کی طرف چلا، دوسری طرف تربیت ربی اس جماد کو جو فطری تقاضاء ارتقائی سے نبات بننے چلا تھا وہ طاقت و تہذیب صلاحیت ہی سمیٹتا جا رہا تھا جو اس کو حیوانیت سے نکلنے میں لگاتار مدد دے رہی تھیں ——— آدم علیہ السلام کے آغاز پر غور کرو، پھر وسط پر غور کرو، پھر اخیر پر غور کرو، مگر حکیمانہ غور کرو۔ تب جو نقشہ بتایا گیا ہے وہ انشاء اللہ اپنی اصلیت و معقولیت کو اس وضاحت سے سامنے کھڑا کر دے گا اور چمکا دے گا گویا بادل پھٹا اور چاند نکل آیا۔

آدم علیہ السلام آغاز میں جب وہ باغ عدن میں برہنہ ٹہلا کرتا، درختوں کے پھلوں کو اچک اچک کر کھایا کرتا تھا اور باغ کے بہتے ہوئے چشموں میں سے منہ لگا لگا کر ان کا پانی پیتا رہتا تھا کیا کچھ اور ایک ترقی یافتہ حیوان کے سوا۔ اور کیا اس وقت وہ انسان تھا؟ اس قسم کا

انسان جو اب تصوّر میں آتا ہے اور جو بعد کو بنا۔ ہرگز نہیں۔ البتہ اس میں انسانیت کا بیج داخل ہو چکا تھا جو پنپ رہا تھا اور اپنے بالیدہ و سربرآوردہ ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ صورتی ہی لحاظ سے نہیں معنوی لحاظ سے بھی۔ معنوی لحاظ سے یہ بیج کیا تھا۔ الہام الٰہی جو اس پر ٹھہر ٹھہر کر اتر رہا تھا۔ پھر کب انسان بنا؟ تب ہی، تو جب کہ اس نے درختِ حکمت کا پھل کھایا اور اس سے اس کی کند افتادہ حیوانی عقل چمک اٹھی۔ پھر پشیمان ہوا، پھر احساسِ غلطی کیا، پھر رویا اور گڑگڑایا اور مدد مانگی۔ پھر جو مدد آئی اس کو محسوس کیا اور اس کی روشنی میں آگے بڑھا۔ اور کیا یہ سب کچھ تربیتِ ربّی ہی کے سہارے سے نہیں ہوا۔

جنّیات

حقائقیاتِ جنّی

(۱) جنّوں پر اعتقاد رکھو اور اس نظر سے اعتقاد رکھو کہ انسانی زندگی میں ان کو دخلِ عظیم حاصل ہے اتنا ہی دخلِ عظیم جتنا ملائکہ کو حاصل ہے۔ فرق صرف نوعیت کا ہے۔ ملائکہ کا دخل تعمیری، ہدایتی اور امدادی ہے۔ اجنّہ کا دخل تخریبی ضلالتی اور فسادی ہے۔ ملائکہ انسان کو بناتے ہیں ہدایت کرتے ہیں مدد دیتے ہیں۔ اجنّہ انسان کو بگاڑتے ہیں گمراہ کرتے ہیں فساد میں ڈالتے ہیں۔ ابلیس اپنی ذرّیات کے ساتھ اجنّہ ہی میں سے ہے جو تخریب کے لئے انسان کے پیچھے مسلسل لگا ہوا ہے، اگرچہ یہ بھی ہے کہ اس کی تخریب میں تعمیر کا پہلو بھی لپٹا ہوا ہے۔ اس کے بگاڑ میں بناؤ بھی ہے لیکن یہ ربوبیت الٰہی کے فضل سے ہے ابلیس کی نیّت سے نہیں۔

(۲) اجنّہ، ملائکہ سے اشبہ ہیں مگر وجنّیت میں نہیں جسمیت میں اور جسمانی طاقت میں۔ اجنّہ بھی اثیری ہیں اور وہ اثیری ہی آگ سے بنے ہیں عنصری آگ سے نہیں۔ اس لئے وہ بھی ملائکہ کی مانند عنصری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ البتہ اگر وہ خود چاہیں تو رونما ہو سکتے ہیں یا پھر اثیری نگاہ والے نہیں ارادہ ذاتی سے دیکھتے ہیں اسی طرح جس طرح عنصریات کو یعنی محسوسات کو دیکھتے ہیں۔ ملائکہ نور سے ہیں اجنّہ نار سے ہیں نار لطیف سے نار کثیف سے نہیں نارِ لطیف نور سے جس درجہ مشابہت رکھتی ہے وہ معلوم ہے۔

(۳۳) اجنّہ ہی کا ایک گروہ گروہِ شیاطین ہے۔ اسی گروہ شیاطین کا سردار اعظم ابلیس ہے جو شیطان اکبر کی شان رکھتا ہے، باقی شیاطین اس کی ذرّیات ہیں جن کی تعداد شمار سے باہر ہے، جن کی نسلیں قیامت تک نسل آدم کے ساتھ چلتی اور اس سے لپٹی رہیں گی ــ شیاطین کا طبعی وظیفہ شرارت ہے اور سعیِ ضلالت ۔ یہ وظیفہ نہ چھوٹ سکتا نہ گھٹ سکتا مگر اس وقت جس وقت انقلابِ ماہیّت ہو جائے ۔ انقلابِ ماہیت روحانیت ہی کے عمل سے ہو سکتا ہے مگر معمولی روحانیت کے عمل سے نہیں کسی رُوحِ عظیم کی عظیم روحانی عملیت سے۔ جیسا کہ فاروق اعظمؓ کی روحِ عظیم کی روحانیت عظیمہ سے ہوا جس کی شرح یہ ہے کہ ان کا شیطان ان کا فرماں بردار تابع بن گیا اور ان کی خدمت کرنے لگا بجائے اس کے کہ بد خدمتی کرتا ــ ہر انسان پر ایک شیطان مسلّط ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اس کو بہکاتا رہے نیکی سے ہٹنے اور بدی سے لپٹ جانے کے لئے ــ بہتوں پر کامیاب ہو جاتا ہے تھوڑوں پر ناکامیاب۔ ان تھوڑوں میں ولی اور نبی پورے محفوظ و مطمئن لوگ ہیں۔ ان پر شیطان کا بس بالکل نہیں چلتا مگر ولی پر اس وقت سے جب سے وہ ولایت کو پالیتا ہے نبی پر پیدائش سے لے کر موت تک ۔ لیکن لغزشیں نبی سے بھی قبل نبوت کرا سکتا ہے، البتہ گناہ کسی وقت بھی نہیں کرا سکتا ــ ابلیس آدمؑ کے ساتھ لگایا گیا تھا اور اس کا ایک وار چل بھی گیا۔ مگر یہ وار گناہ کا نہیں تھا لغزش کا تھا۔ وہ بھی کب چلا تھا تب جب کہ آدم نبی نہیں بن چکے تھے ۔ پھر بھی اوچھا پڑا۔ آدم اونگھتے ہی چوکنّے ہو گئے ــ شیاطین علم مغیبات کا بھی ایک حصہ رکھتے ہیں اور انھیں سے سحرۃ اور کہنۃ تعلیم مغیبات پاتے ہیں اور اس کے بل پہ سحر اور کہانت کا کام کرتے ہیں ــ لیکن شیاطین کا علم مغیبات صرف سفلی ہے جو سماء کے نیچے کی دنیا تک محدود ہے اگرچہ وہ سماوی مغیبات کے بھی درپے رہتے ہیں مگر ان تک ان کا گذر نہیں ہوتا کیونکہ سماوی ملائکہ انھیں وہاں تک پہونچنے نہیں دیتے اور کواکب کی مافوق العادت حرارتوں کے ذریعے انھیں روک دیتے ہیں ــ علوی سماوی مغیبات کا علم صرف ملائکہ اور ملائکہ سماوی سے حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے لئے ملکوتی طبیعت درکار ہے خواہ وہ فطرتاً میسر ہو جیسا کہ نبیوں میں ہوتی ہے خواہ ملکوتیت آفریں مجاہدوں کے ذریعے ہو جیسا کہ ولیوں کا معاملہ ہے۔

(۴) اجنّہ میں صالحین بھی ہوتے ہیں جو نبیوں اور ولیوں کے امتی، مرید، اور رفیق بھی بن جاتے ہیں — حضرت محمدﷺ پر جنوں کا ایک گروہ ایمان لایا تھا اور اس میں کچھ کچھ صحابی بھی بن گئے تھے جن میں سے ایک سے جو بہت طویل عمر تھے شاہ عبدالرحیم صاحب محدث والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ملاقات ہوئی تھی۔

انسانیات

حقائقیات انسانی

(۱) انسان کی اہمیت پر بھی اعتقاد رکھو — انسان بھی اہمیّت رکھتا ہے ذاتی حیثیت سے بھی اور کائنات کے تعلق سے بھی اور اتنی بڑی اہمیّت رکھتا ہے کہ حضرت الوہیّت کے بعد اسی کا درجہ ہے — انسان خلاصۂ کائنات ہے اور مجموعۂ موجودات۔ انسان مخدومِ کائنات ہے اور خلیفہ خالقِ موجودات — انسان ارتقاءِ عالم کا آخری پہل ہے اور جہدِ عالم کا تنہا ماحصل — انسان ترقی مادّی کا پورا نچوڑ ہے اور تعلّیِ روحانی کا مکمل عطر — انسان احسن تقویم کے خلعت سے مخلّع ہے اور خلیفۃ اللہ کے تاج سے متوّج۔ انسان تنہا مہبطِ وحی والہام ہے اور اکیلا حاملِ دین ونظام — انسان تنہا سائرالی الذات ہے اور اکیلا جاذبِ صفات — جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ پر ٹھٹھک گیا اور انسان بڑھتا ہوا اور دوڑتا ہوا وہاں پہونچ گیا جہاں کی بابت کہا گیا ہے؎ نماند سراپردہ اِلّا جلال۔ فرشتہ صفات تک بھی نہیں پہونچ سکتا، اس کی آخری حد ظلالِ صفات اور مقامِ اسماو شیونات ہے لیکن انسان اس مقام پہ ہے کہ؎ تو عین ذات می نگری در تبسّمے — انسان ہی اکیلا خود مختار ہے اس شان کا کہ چاہے تو فرشتہ بن جائے اور چاہے تو شیطان ہو جائے شیطان بھی خود مختار ہے مگر صرف بدی پر مختار ہے نیکی میں مجبور۔ فرشتہ بھی بااختیار ہے مگر نیکی میں بااختیار بدی میں بے اختیار — انسان ہی ہے جو شیطان کی مانند حضرت الوہیت تک سے بغاوت کر بیٹھ سکتا ہے پھر لچک رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک دم میں بغاوت کو اطاعت سے بدل دے اور شیطان سے فرشتہ بن جائے۔ انسان ہی وہ باہمت ہے جو اپنی استطاعت کو بھی نہیں دیکھتا اور اپنی جسارت کی طرف بھی نہیں تاکتا اور جھپٹ بڑھ کر اس بارِ امانت کو

جس کو دوسرا نام بارِ خلافت ہے جس کو آسمان زمین بھی نہ اُٹھا سکے سر لے لیتا ہے اور ظلومیت و جہولیت کا طعن سہتے ہوئے بھی اس کے حق ادائیگی میں کھپتا رہتا ہے۔

(۲) انسان، روحِ کلّی اور مادّہ کلّی کا مجموعۂ مرکب ہے۔ اس وجہ سے پوری کائنات اسمیں چلا سمٹ آئی ہے۔ اسی لئے وہ چھوٹا تو اتنا ہے کہ کائنات کے سامنے صفر بھی نہیں بن سکتا پھر بڑا بھی اتنا ہے کہ جب کھلتا اور پھیلتا ہے تو پوری کائنات کو ایک لقمہ بنا کر نگل جاتا ہے گویا سمندر قطرے کو نگل رہا ہے اور دشت ذرّے کو پھر بھی تشنہ رہ جاتا ہے اور جب کہیں اپنی سمائی نہیں دیکھتا تو ذات حضرت الوہیت میں گھس پڑتا ہے اور غریب یہاں ٹھہر کر تسلی لیتا ہے ———

انسان اپنی تمام ذات میں قالبًا ایک ہی انسان نہیں ہے بلکہ تہہ در تہہ چند در چند ہے قالبِ عنصری سے لیکر قالبِ ہیولانی تک جو مادۂ کلیّہ سے تیار ہوا ہے اسی طرح روحًا بھی ایک ہی انسان نہیں ہے بلکہ تہہ در تہہ چند در چند ہے جو روحِ حیوانی سے لے کر روحِ کلّی تک پھیلا ہوا ہے ——— لیکن انسان کی یہ عظمت عام طور پر صرف استعدادی ہے حالی نہیں ہے۔ کہیں کہیں حالی بھی بن جاتی ہے لیکن کب؟ جبکہ علویت پسند رہے، علویت طلب بنے، ربانیت پسند رہے، ربانیت طلب بنے اور یہ بھی ہو کہ اس راہ نازک کو قدم خود رائی سے طے نہ کرے، قدمِ اتباعی سے طے کرے اس ضابطہ ربانی کے ماتحت جس پر ملہمین چل چکے ہیں اور چل کر شاہ راہِ طریقت طیار کر چکے ہیں ورنہ انسان مردِ ضائع و قانع ہو کر رہ جاتا ہے اور کبھی بہک کر اس سے بھی نیچے چلا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہاں تک نیچے جاتا ہے کہ اسفل السافلین میں پہونچ جاتا ہے ———

اسی لئے انسان کو دینِ الٰہی دیا گیا جس کے سہارے وہ مجوزہ و مقررہ الٰہی شاہ راہِ زندگی کو یقین اور بھروسے کے ساتھ متعارف و متعین کر لے سکتا ہے اور حوصلہ ہو تو اس پر چل سکتا ہے جس پر چل کر اور جس پر ہی چل کر مراحلِ عروج طے کر سکتا ہے اور منزلِ تکمیل تک پہونچ سکتا ہے اس منزلِ تکمیل تک نہیں جس کو اس نے اپنی جاہلانہ خود رائی سے مقرر کیا ہے بلکہ اس منزلِ تکمیل تک جو خود حضرت الوہیت کی معرفت کاملہ کے ماتحت مقرر ہے ——— دینِ الٰہی وہ ضابطہ زندگی انسانی ہے جو حضرت الوہیت کی طرف سے قطعی طور پر مقرر ہے جس کو یا تو یقین اور تمکین کے ساتھ بالکل

پکڑ لو اور آنکھیں بند کر کے نجات اور کمال تک پہونچ جاؤ یا بالکل چھوڑ بیٹھو اور سیدھے جہنم میں پہونچ جاؤ۔ ان دونوں صورتوں کے بیچ میں کوئی تیسری صورت نہیں ــــ اے انسان خدا کے لئے حقیقت کے اس نکتے کو سمجھ اور اپنے کو تباہی میں نہ ڈال۔

احوالیاتِ انسانی

(۱) انسان علویت و سفلیت کی حیثیت سے دو قسم ہے، علوی انسان اور سفلی انسان ـ علوی انسان وہ ہے جو اپنی فطری قوتوں کو غیر معمولی نشو و نما دے کر کسی نہ کسی پہلو سے برتر اور شاندار انسان بن گیا ہے جس کو چار و ناچار اعلےٰ انسان ماننا پڑتا ہے جو بہر حال حیوانوں سے غیر معمولی ممتاز دکھائی دیتا ہے ـ سفلی انسان وہ ہے جس نے فطری قوتوں کو غیر معمولی نشو و نما دینے کی زحمت نہیں اٹھائی اور حیوانوں پر غیر معمولی امتیاز نہیں لا سکا ـ چار و ناچار سفلی انسان اور حیوانی انسان کہلاتا ہے ــــــــ علوی انسان بھی ربانیت و نفسانیت کی حیثیت سے دو قسم میں بٹا ہوا ہے ربانی انسان اور نفسانی انسان ـ ربانی انسان وہ ہے جو علویت کی دین میں ربانیت سے نہیں ہٹ گیا ہے جو علویت کی راہ پر شاہ راہِ ربانیت کو نظر میں رکھتے ہی ہوئے چلا ہے جس نے حضرت ربیت سے کسی حال میں رشتہ نہیں توڑا جس نے ضابطہ ربانی سے کسی حال میں تعلق نہیں چھوڑا ــــ ربانیت کے بھی چند در چند مرتبے ہیں اور ان کے لحاظ سے ربانی انسانوں میں بھی علویت کے فرقِ مراتب ہیں ـ ادنےٰ علویت، اوسط علویت، اعلےٰ علویت، پھر اعلےٰ الاعلےٰ علویت ـ سب سے اعلےٰ یا الاعلےٰ ربانی وہ ہے جو نبوت پر فائز ہو جاتا ہے اور نبی بن جاتا ہے ـ یہ وہ خاص الخاص، اور اخص الخواص ربانی ہے جو نہ تنہا خود ربانیت سے چمٹا ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو ربانیت کی طرف بلاتا ہے اور ربانیت سے چمٹا دینے کی مخلصانہ اور والہانہ جد و جہد کرتا ہے ـ جس کو دین الٰہی کے نام سے ضابطہ ربانی براہ راست حضرت ربوبیت کی طرف سے سپرد کیا جاتا ہے، جس کو دعوتِ ربانی پر مر اختصاص مامور کیا جاتا ہے اور جس کو دعوت ربانی پر مامور بنا کر براہ راست حمایتِ ربی کے اندر لے لیا جاتا ہے تاکہ ذمہ داری، نگہداشتگی سے جدا نہ رہ جائے اور تفویض، لا ابالیت سے مجروح و مخدوش نہ بن جائے ـ یہ شخص

خلیفۃ اللہ کا منصب انتہائی بھی پالیتا ہے اور اس ذریعے سے جزو اللہ یا ضمیمۃ اللہ بن کر مرتبۂ حاکمیت و مالکیت و آمریت و نافذیت میں اور معاملاتِ حاکمانہ و مالکانہ و آمرانہ و نافذانہ میں رفیق اللہ بن جاتا ہے۔ یہ اس خاص مرتبے کی وجہ سے صرف عبد اور عابد نہیں رہ جاتا حبیب اور رفیق بھی بن جاتا ہے — مبارک ہو اس شخص کو اور سلامتی ہو اس شخص کے لئے — اسی لئے اس کا ایمان و کفر اللہ کا ایمان و کفر اس کی پیروی و مخالفت اللہ کی پیروی و مخالفت اس کی دوستی و دشمنی اللہ کی دوستی و دشمنی اس کی خدمت و بے خدمتی اللہ کی خدمت و بے خدمتی بن جاتی ہے۔ اس کی پیروی میں سلامتی اور دونوں جہان کی سلامتی، اس کی مخالفت میں ہلاکت اور دونوں جہان کی ہلاکت رکھ دی جاتی ہے۔ جس کا جی چاہے اس کی پیروی کرے اور سلامتی کی طرف جائے جس کا جی چاہے اس کی مخالفت کرے اور ہلاکت کی طرف جھپٹے

نبی سے نیچے اتر کر ولی کا درجہ ہوتا ہے۔ یہ بے چارہ نہ مامور ہے نہ منصور ہے نہ نائب ہے (بلاواسطہ) نہ ناظم نہ متبوع ہے نہ مرکوز ہے نہ حبیب ہے نہ رفیق ہے البتہ مقبول ہے اور محفوظ ہے۔ مودود ہے اور مسعود ہے۔ مقدس ہے اور متبرک ہے۔ اس سے برکت مل سکتی ہے اور سعادت میں اعانت ہاتھ آسکتی ہے اور اس لئے اس کی محبت و رفاقت بھی مفید و معاون ہو سکتی ہے بشرطیکہ محبت و متابعت نبی سے ٹکراتی نہ ہو اور ضابطہ ربانی یعنی دین الٰہی کی پیروی کو نقصان نہ پہونچاتی ہو — ولی سے گھٹ کر عامی مومن صالح ہے۔ یہ بے چارہ کچھ بھی نہیں ہے سوا اس کے کہ ایک اچھی مثال ہے ربانیت کی۔ اس سے اتنا ہی فائدہ ہے کہ اس کو دیکھ کر عقیدۂ ربانیت تازہ ہو جاتا ہے اور اس کی صحبت میں ربانیت کی تازگی پختگی اختیار کرتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کی صحبت بھی قابل قبول اور لائق حصول ہے۔

نفسانیت بھی چند در چند درجے رکھتی ہے اور ان کے لحاظ سے نفسانی انسان بھی مختلف المدارج ہے۔ سب سے سخت نفسانی انسان وہ ہے جو انسانی شیطان اور ابلیس کا انسانی قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ کافر بھی ہوتا ہے اور مکفر بھی یعنی دوسروں کو بھی کفر میں

جھونکتا رہتا ہے یہ فاسق بھی ہوتا ہے اور مفسّق بھی یعنی دوسروں کو بھی فاسق بناتا رہتا ہے۔ ہالک بھی ہوتا ہے اور مہلک بھی یعنی دوسروں کو بھی ہلاکت کی طرف ڈھکیلتا رہتا ہے۔ ابوجہل اور ابولہب عہد محمدیؐ میں اس درجۂ نفسانیت کی روشن ترین مثالیں ہیں ـــ اس کا لقب امام کفر و فسق ہوتا ہے ـــ اس سے گھٹ کر کافر محض اور فاسق محض ہوتا ہے۔ یہ خود کفر و فسق کرتا ہے دوسروں کو کفر و فسق کی طرف دعوت نہیں دیتا ہے۔ پھر بھی چونکہ نفسانیت کی مثال ہوتا ہے اس لئے خاموش مرض متعدّی ہوتا ہے اس کی مثال طاعونی چوہے یا وبائی مریض کی مثال ہے جو دوسروں کو طاعون اور وبا کا شکار بنانے کا ارادہ نہیں کرتا اگرچہ لوگ بے ارادہ اس سے وبائی اثر لیتے رہتے ہیں، اور وبا کے شکار بنتے رہتے ہیں ـــــــــــ کافر و فاسق بھی دو قسم کا ہوتا ہے:

ایک کافر مطلق اور فاسق مطلق یا کافر کلی اور فاسق کلی جس کی شان یہ ہوتی ہے کہ ضابطۂ ربّانی کا کلی انکار کرتا ہے یعنی حضرت الوہیت کا بھی انکار اور حضرت نبوت کا بھی انکار، ضابطۂ الٰہی اور دین الٰہی کا بھی انکار، جزا سزا، حساب کتاب، حشر نشر، جنت جہنم، نیکی بدی کا بھی انکار۔ پھر انکار ہی نہیں مخالفت بھی کرتا ہے اور اتنی شدید مخالفت کہ مٹ جانے یا مٹا دینے کا منصوبہ باندھ لیتا ہے۔ یا انکار ـــ تو نہیں کرتا مگر ایمان اور عزم اتنا کمزور رکھتا ہے اور فطرت کی سلامت روی کو اتنا بگاڑ لیتا ہے کہ ہر فسق کر لیتا ہے اور کسی فسق سے جھجھکتا نہیں ـــ نبیوں اور ولیوں کی مانند ان انسانی شیطانوں کی بھی تعداد بہت قلیل ہوتی ہے مگر یہ بہت قلیل تعداد فتنے کو کثیر و غفیر بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے ـــ دوسرا کافر جزئی اور فاسق جزئی یہ ضابطۂ ربّانی کا بالکلیہ انکار نہیں کرتا بلکہ اس کے خاص خاص جز کا انکار کرتا ہے۔ اسی طرح تمام فسقوں کو اپنے اندر اکٹھے نہیں کر لیتا بلکہ بعض بعض فسق کا مرتکب رہتا ہے۔ ان کی بھی کئی قسم ہوتی ہے ایک وہ جو داعی الی الکفر اور داعی الی الفسق ہوتا ہے یعنی دوسروں کو بھی کفر اور فسق کی طرف دعوت دیتا رہتا ہے۔ اور اس کی بھی دو قسم ہے ایک وہ جو داعی محاربت ہوتا ہے یعنی دعوتِ کفر و فسق بھی دیتا رہتا ہے تاکہ نفسانیت مضبوط ہو اور ایمان و تقوے کی مخالفت بھی کرتا رہتا ہے تاکہ ربانیت بھی کہیں جگہ نہ بنا لے۔ ان میں انتہائی اور اعتدالی کی

قسمیں ہوتی ہیں۔ انتہائی وہ جو مخالفت کی انتہا تک پہونچ جاتا ہے اور جنگ و فیصلہ پر کمر باندھ لیتا ہے۔ مٹ جاتا ہے یا مٹا دیتا ہے۔ اعتدالی وہ جو مخالفت کو درمیانی حد تک رکھتا ہے خود زندہ رہنا چاہتا ہے اور بشرط زندگی کے ساتھ فتنۂ مخالفت کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا وہ جو صرف عامل کفر و فسق ہوتا ہے داعیٔ کفر و فسق نہیں ہوتا۔۔ دورِ حاضر میں مغربی قومیں اماماً اور بعض بعض مشرقی قومیں تبعاً داعیٔ کفر و فسق قسم کی کافر و فاسق ہیں۔۔۔
اللّٰھُمَّ احفظنا منھنّ و نعوذ باللّٰہ من شرّ ودھن۔

نبی (۱) نبی پر بھی ایمان لاؤ۔ جیسے کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اللہ پر ایمان لانا ربانیت کے لئے کافی نہیں ہے۔ نبی ربانیت کا زینہ ہے اللہ ربانیت کا بام ہے۔ زینے کے بغیر بام تک کیسے پہونچ سکتے ہو۔۔۔ نبی کی گنتی مصرّح نہیں ہے۔ نبی ہر قوم میں ہو سکتا ہے۔ البتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہاں ہر قوم میں نذیر کا ہونا ضروری ہے جس کو اسی قوم سے ہونا چاہئے اور ہر قوم کے لئے ہادی کا ہونا ضروری ہے جس کا اسی قوم سے ہونا ضروری نہیں۔ نبی ہر عہدِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے۔ نبی ایک ہی زمانے میں چند ہو سکتے ہیں۔ مگر نبوّت کلّی کے زمانے میں نہیں نبوّت جزئی کے زمانے میں۔۔ ایسی صورت میں ہر نبی ایک امت کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے، اور اس نبی پر ایمان لانا بھی اسی امت پر واجب ہوتا ہے دوسری امتوں پر نہیں اگر اس نبی کی نبوّت کی معرفت دوسرے امتوں پر روشن نہ ہوئی ہو اور اس کی پیروی تو دوسری امتوں پر کسی حال میں واجب نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک زمانے میں ایک ہی قوم میں کئی کئی نبی ہوں البتہ اس صورت میں ایک نبی امام ہوتا ہے دوسرے مقتدی۔ مگر یہ اقتدا انتظامی ہوتی ہے منصبی نہیں ہوتی ہے۔ منصب تو سب کا ایک۔ کوئی کسی کا تابع نہیں۔ سب براہ راست حضرتِ الوہیت کے تابع ہوتے ہیں۔۔۔ نبی آدم کے وقت سے مسلسل رہے۔ کوئی زمانہ نبی سے خالی نہیں رہا۔ جیسے کہ کوئی امت نبی سے خالی نہیں رہی۔ موجودہ زمانہ بھی نبی سے خالی نہیں ہے نہ آئندہ کوئی زمانہ نبی سے خالی رہے گا قیامت تک۔ خود قیامت بھی خالی نہ رہیگی بعد قیامت کا زمانہ بھی خالی نہیں رہے گا نہ رہ سکتا ہے۔ بعد قیامت بھی نبوّت کی

ضرورت تو ایسی ہی رہے گی جیسی قبل قیامت رہی ہے اور رہے گی ۔۔ بعد قیامت نبی نہ ہوں تو جہنمیوں کو کون جنت سے نکلوائے گا اور جنتیوں کو کون جنت سے آگے بڑھائے گا۔ شفاعت شفارش ہی نہیں ہے ہدایت بھی ہے۔ اس حیثیت سے بھی شفاعت تتمۂ نبوت ہے۔ البتہ نبوت بعد قیامت ہر نبی کا حصہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک نبی کا جو نبی آخر و کامل ہے۔ نبی مرنے کے بعد بھی نبی رہتا ہے اس وقت تک جب تک دوسرا نبی ظاہر نہ ہو جائے۔ نبی آخر موت کے بعد آخری نبی کی شان سے دائمی نبی رہتا ہے۔ نبی آخر کے بعد کوئی نبی آ ہی نہیں سکتا جو اس کی نبوت کو بدلوا دے ـــــ نبی محض قیاس سے نہیں متعین ہو سکتا۔ بلکہ صراحت سے۔ صراحت الٰہی سے یا صراحت نبی سے یعنی یا تو خود حضرت الوہیت نے کسی کو نبی بتایا ہو یا ایک نبی نے کسی دوسرے کو نبی کہا ہو۔ مثلاً انبیاء مالستان (ہندوستان) کو شخصی طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں فلاں شخص یقیناً نبی تھے۔ صرف استدلال اور یقین رکھا جا سکتا ہے کہ مالستان بھی انبیا رکھتا تھا۔ کیونکہ ان کی شخصیتوں کے ساتھ نہ کسی کتاب الٰہی میں صراحت ہے کہ وہ نبی تھے نہ کسی نبی نے کہا کہ وہ نبی تھے۔

(۳) پہلے نبی آدمؑ تھے جیسا کہ پہلے انسان بھی تھے۔ ان کے بعد وہ انبیا ہیں جو الہامی کتابوں میں صراحت سے سلسلۂ انبیا میں مذکور ہیں۔ انبیا کے متعدد سلسلے ہوئے متعدد انبیائی ملکوں کے لحاظ سے۔ ایک سلسلہ اسرائیلی سلسلہ ہے جس کے ایک سرے پر اسحٰقؑ یا اسرائیل ہیں۔ دوسرے سرے پر عیسیٰؑ۔ یہ سلسلہ یہودانی سلسلہ بھی کہلا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ یہودیہ کے ساتھ مخصوص ہے جو شام کا ایک خطہ ہے اور اس زمانے کے فلسطین اور شرق اردن کا مجموعہ ہے اور اب فلسطین مع شرق اردن کہلاتا ہے ـــــ

دوسرا سلسلہ اسماعیلی سلسلہ ہے جس کی پہلی کڑی اسماعیلؑ ہیں آخری کڑی حضرت محمدؐ ہیں ـــ یہ سلسلہ عربی سلسلہ ہے کہ عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان دونوں سلسلوں کی جڑ ابراہیمؑ ہیں۔ یہ دونوں سلسلے شامی سلسلے بھی کہلاتے ہیں۔

اس لئے کہ ابراہیمؑ شامی تھے۔ اُن میں کی ایک شاخ اپنی جڑ ہی کی سرزمین یعنی شام میں جس کا ایک حصہ یہودیہ ہے بچی رہی ہے۔ اگرچہ تھوڑے دنوں کے لئے اس نے دو دوسری سرزمینوں کو بھی سرفراز فرمایا جن میں سے ایک مصر ہے موسیٰؑ کے ابتدائی زمانے میں اور یوسفؑ کے عہد میں۔ دوسرا ابی سینیا ہے موسیٰؑ کے آخری زمانے میں لیکن ان دونوں نے اس شاخ کی صرف صورت دیکھی پھل نہیں چکھا ـــــ البتہ اس شاخ نے عیسیٰؑ کے بعد اُن کے حواریوں کے ذریعہ باہر بھی قدم رکھا اور مشرق و مغرب دونوں میں اپنے کو پھیلایا ـــــ دوسری شاخ نے باہر نکل کر عرب کی پتھریلی، ریتلی، بنجر، اوسر زمین میں اپنی جڑ جمائی اور وہیں خاموش بڑی بڑی مدت تک اپنے کو مضبوط کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی سربرآوردگی کا وقت آیا اور اُس وقت یکایک پھیلی اور اس زور سے پھیلی کہ پوری زمین پر چھا گئی۔ یہاں تک کہ ایک خطہ بھی نہیں بچا جس پر اس کا سایہ نہ پڑا ہو اور جس نے اس کا پھل نہ چکھا ہو ـــــ یہ کون سا وقت تھا؟ یہ وہ وقت تھا جب آخری نبی محمدؐ نمودار ہوئے جو صرف شامی سلسلے کے آخری نبی نہ تھے بلکہ پورے آدمی سلسلے کے آخری نبی تھے ـــــ ان دو سلسلوں کے علاوہ چند دوسرے سلسلوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں سے ایک ایرانی سلسلہ تھا۔ ایک عراقی سلسلہ تھا۔ ایک ہمالیائی (ہندوستانی) سلسلہ تھا۔ ایک چینی سلسلہ تھا۔ ایک مصری سلسلہ تھا ایک یونانی سلسلہ تھا ـــــ لیکن یہ سارے سلسلے آخری نبیؐ کے ظہور کے بعد قدرتی طور پر ختم ہو گئے کیونکہ اب وہ نبیؐ آچکا تھا جس کے لئے پوری زمین ایک لپٹے ہوئے کاغذ کی طرح لپیٹ کر اُس کے فلک وسعت بلکہ عرش وسعت ہاتھوں کو سونپ دی گئی تھی۔

محمد و احمد صلی اللہ علیہ وسلم

(۱)۔ جامع و کامل اور آخری نبیؐ پر بھی ایمان لاؤ جن پر ایمان لائے بغیر چاہے شام کی تمام نبوتوں پر ایمان لا کر ایمان میں غرق بھی ہو جاؤ" ایمان کا کام چل نہیں سکتا۔ رباعیت اسکی

آخری ارتقائی صورت میں نصیب نہیں ہو سکتی اور اس لئے سعادتِ کاملہ کی ہوا بھی میسّر نہیں آ سکتی۔

(۲)۔ محمدؐ وہ مکمّل اور انتہائی نقطۂ حقیقت ہیں کہ پورا پورا تو انہیں کون ایک پہچان سکتا ہے سوا ایک حضرتِ اُلوہیت کے جو اُن کی خالق ہے۔ جن کی تفسیر حقیقتِ کاملہ کی تفسیر ہے، جن کی تفسیر پورے زمان و مکان کی تفسیر، پوری کائنات کی تفسیر پوری صلاحیت وقابلیت کی تفسیر، پورے ارتقا و اتقا کی تفسیر، پوری توسیع و تکمیل کی تفسیر ہے جن کی تفسیر خود حضرتِ اُلوہیت کی تفسیر ہے اور حضرتِ اُلوہیت کے تمام صفات و شیونات و افعال و نتائج افعال کی تفسیر ہے۔ کیونکہ محمدؐ و احمدؐ اور احد و حمد میں صرف میم کا فرق ہے۔ وہ میم جو مظہریت و مسکنیت کی میم ہے۔ جو اس حقیقت کی طرف اشارے کی انگلیاں اٹھاتی ہے کہ محمدؐ و احمدؐ مظہر و مسکن ہیں احد اور حمد کے جو حضرتِ اُلوہیت کی فلسفیانہ تعبیریں ہیں ——— البتہ زمانہ جو اُن کی معرفتوں کا خزانہ ہے اُن کی بڑی بڑی تفسیریں کر سکتا ہے اور مُسلسل تفسیریں کر سکتا ہے مگر قسط وار کر سکتا ہے پھر بھی مکمّل نہیں کر سکتا۔ ہر قسط میں صرف ایک ہی حصہ تفسیر کر سکتا ہے ۔ اور اس لئے ہمیشہ صرف ناقص تفسیر کر سکتا ہے۔ البتہ بہ سلسلۂ لا انتہا ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ مفسَّر کی مانند مفسِّر بھی نامحدود ہے اس فرق کے ساتھ کہ مفسَّر حقائقاً نامحدود ہے مفسِّر غریب صرف امتداداً نامحدود ہے ——— پھر بھی ہر مومنِ محمدؐ کو حقِ تفسیر پہنچتا ہے کیونکہ وہ کچھ نہ کچھ عارفِ محمد ہے کیونکہ متوسّل محمدؐ ہے ——— اس لئے ناقص معرفت سہی پیش کی جاتی ہے۔

(۳)۔ محمدؐ کے اختصاصاتِ خاص اور امتیازاتِ خاص مشتے نمونہ از خروارے کے مطابق یہ ہیں ——— محمدؐ اوّل بھی ہیں کیونکہ انہوں نے خود فرمایا تھا " میں اس وقت بھی تھا جب آدمؑ مٹی اور پانی کی درمیانی حالت میں تھے۔ آخری بھی ہیں۔ خاتم النبیین حضرتِ اُلوہیت ہی نے انہیں فرمایا۔ ازلی نبی ہیں، ابدی نبی ہیں، عالمی نبی ہیں۔ صرف ارضی عالم کے نہیں، سماوی عالم کے بھی۔ خلقی نبی ہیں یعنی کُل مخلوقات کے نبی ہیں۔

مجمع الانبیا ہیں، امام الانبیا ہیں۔ سید الانبیا ہیں، خاتم الانبیا ہیں، قبل القیامت
نبی بھی ہیں، فی القیامت نبی بھی ہیں، بعد القیامت نبی بھی ہیں۔ خلیفۃ اللہ اعظم نبی
بھی ہیں، رسول اعظم نبی بھی ہیں۔ اُس دین ربانی الٰہی کے نبی ہیں جو تمام اگلے اور
پچھلے دینوں کا جامع خزانہ ہے۔ اور تمام اگلی پچھلی ربانی حکومتوں کا مکمل آئینہ ہے
اُس صحیفۂ ربانیہ الٰہیہ کے نبی ہیں جو تمام اگلے پچھلے صحیفوں کا اور تمام اگلے پچھلے
ربانی نسخوں کا مخزن و معدن ہے ـــ جامع نبی ہیں کامل نبی ہیں کلی نبی ہیں حقیقی
نبی ہیں۔ امام الربانیین ہیں افضل المخلوقین ہیں۔ کامل مظہر رب العالمین ہیں۔
رحمۃ للعالمین ہیں۔ مالک الجنت ہیں شافع القیامت ہیں ــ جن پر ایمان تمام
نبیوں پر ایمان کے برابر اور بہت کچھ زائد بھی ہے۔ اور اس کو شامل بھی ہے اور
جن کی پیروی تمام نبیوں کی پیروی کے برابر اور بہت کچھ زائد بھی ہے کیونکہ وہ خود
تمام نبیوں کا مجموعہ ہیں بہت کچھ زیادتی کے ساتھ بھی اور ان کا دین تمام دینوں کا
مجموعہ ہے بہت کچھ زیادتی کے ساتھ ـــــــ مقام حمد پر فائز ہیں حالانکہ یہ چیز
خصوصیات ربی سے ہے۔ ظلاً فائز ہیں مگر دوسرا کوئی نہیں جو ظلاً بھی فائز ہو سکے
کلیت کے مرتبے ہیں۔ جن کی بعثت کی غرض رحمت للعالمی ہے۔ جو دوسرے لفظوں
میں ربوبیت عالمی ہے، کیونکہ رحمت للعالمی پرتو کلی ہے ربوبیت عالمی کی۔ جن
کا منصب خصوصی خلیفۃ اللٰہیت کلیہ عالمیہ ہے۔ جن کا موضوع خصوصی خلافت الٰہیہ
کلیہ عالمیہ اور حکومت ربانی کلی عالمی کا قیام ہے۔ جن کا نظریۂ خصوصیہ توحید کلی جامعی
کاملی اور وحدت کلیہ جامعہ کاملہ ہے وہ توحید ناقص نہیں جو وحدت خالق کو تو سر
پر اٹھا لیتی ہے اور وحدت مخلوق کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتی بھی نہیں بلکہ وہ توحید کامل
جو وحدت خالق اور وحدت مخلوق دونوں وحدتوں کو یکساں اٹھا لیتی اور برابر اٹھاتی
ہے جو تفرقۂ خالق اور تفرقہ فی المخلوق دونوں کو ایک ہی وار میں بالکل معدوم کر دیتی ہے
جن کا نصب العین خصوصیہ تکمیل کلی جامعی کاملی ہے جس میں تکمیل کی تمام قسمیں اور شاخیں
برابر برابر کی شریک ہیں جس میں تنہا تکمیل ذہنیت و عقلیت ہی نہیں تکمیل

ہے۔ بلکہ تکمیلِ صمدیت و عملیت بھی ساتھ ساتھ اُچھل کود رہی ہے۔ جس کی حدِ تکمیلِ انسانیت ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ تکمیلِ فطرت کو بھی لپیٹے ہوئے ہے۔ جن کا عملیہ خصوصیہ ربانیتِ کلیہ کی تخلیق و تعمیمِ مطلق ہے اور ربوبیتِ کلیہ کی توسیع و تنفیذ کامل ہے۔ جس کا منشا انسانیتِ کلیہ کو سعادتِ کلیہ عمومیہ بخشتا ہے۔ جس کا ثمرۂ ادنیٰ فراغتِ مادی اور طمانیتِ روحانی کو انسانوں کی مشترک جاگیر بنا دینا ہے، اس حد تک کہ ایک انسان بھی پورے کرۂ زمین پر یوم قیامت تک کے لئے ایسا بدبخت نہ رہ جائے جو مادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے فراغت نہ رکھتا ہو۔ جو بھوکا نہ رہے ننگا نہ رہے، بے علاج نہ رہے بے علم نہ رہے بے عزت نہ رہے بے خانماں نہ رہے بے سروسامان نہ رہے اور جو روحانی اسبابِ طمانیت کی طرف سے طمانیت نہ رکھتا ہو۔ پھر جس کا منشا صرف انسانیت کو بامِ سعادت تک پہنچانا نہیں ہے بلکہ پوری خلقت کے لیے موقع سعادت مہیا کرتا ہے۔ جس کا ایک جزئی کارنامہ وحدتِ ادیان، وحدتِ اقوام، وحدتِ مذاہب، وحدتِ مشارب، وحدتِ ممالک، وحدتِ مسالک، وحدتِ تہذیبات وحدتِ تعلیمات و تنظیمات، وحدتِ حکومات وحدتِ نظامات اور اس طرح وحدتِ انسانیت بھی، جس کی طرح پڑ چکی، جس کی تعمیر شروع ہو چکی۔ جس کی توسیع جاری ہے۔ جس کی ترقی مسلسل ہے، جس کی تکمیل جھلک رہی ہے، جس کی تعمیم چمک رہی ہے۔ جس پر سارے انسانی دماغ لگے ہوئے ہیں جس پر سارے انسانی اعمال جھکے ہوئے ہیں۔ جن کے نتائج نمایاں ہیں جن کے آثار ہویدا ہیں اور یہ سب کچھ حقیقتِ محمدی اور حکمت و نظامتِ احمدی کے ماتحت ہو رہا ہے۔ ع

فصلے اللہ علی نورِ کزو شد نورہا پیدا

مثنیین و خلفائے محمدیؐ | بلا واسطہ مثنیین محمدیؐ چار ہیں۔ خدیجہ مبارکہؓ۔ فاطمہؑ سیدہؓ۔ عائشہ صدیقہؓ۔ مہدی آخر الزمانؑ —— بلا واسطہ خلفاء محمدیؐ بھی چار ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ۔ عمر فاروقؓ۔ عثمان غنیؓ۔ علی مولاؑ —— بالواسطہ مثنیین محمدیؐ بھی چار ہیں۔ حسنؑ۔ حسینؑ۔ سلمانؓ۔ ابوذرؓ۔ پھر مثنیینِ مثنیین بھی

ہیں۔ وہ مجددین۔ مجتہدین۔ آئمہ روحانیین۔ سلاطینِ متبعین۔ مجاہدینِ راسخین۔ حکماء ربانیین۔

مثالیینؐ و حواریینِ محمدیؐ | عشرہ مبشرہؓ۔ اصحاب صفہؓ۔ اصحاب بدرؓ و حنین ازواج مطہراتؓ۔ بنات عالیاتؓ۔ خدامِ کرامؓ۔

داعیینؐ و فدائیینِ محمدیؐ | نقباء اثنا عشر۔ حمزہؓ و جعفرؓ۔ سعدؓ و زبیرؓ۔ ابو عبیدہؓ و خالدؓ۔ ام عمارؓ و ام سلیمؓ۔ خبیبؓ و عاصمؓ۔ زیدؓ و ابن لحانؓ۔ بلالؓ و اویسؓ۔ مصعبؓ و صہیبؓ۔ جابرؓ و ابو ایوبؓ۔ عکرمہؓ و ابن مسلمہؓ۔ ابو بصیرؓ و ابن طفیلؓ۔ بنت الخطابؓ و زوج بنت الخطابؓ۔

مربیینؐ و حامیینِ محمدیؐ | آمنہؓ و حلیمہؓ۔ عبدالمطلبؓ و ابوطالبؓ۔ ابن حزامؓ و ابن سلامؓ۔ نجاشیؓ و مقوقس۔

مبشرینِ محمدیؐ | بحیرہ اور ورقہ۔

لوازماتِ محمدیؐ۔ ضابطۂ محمدیؐ۔ یا اسلام | ضابطۂ محمدیؐ کیا ہے؟ دینِ اسلام تفسیراتِ محمدیؐ و تعمیلاتِ محمدیؐ

کے ساتھ۔ جس کو دوسرے لفظوں میں اسلامِ محمدیؐ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسلام تو ازلی ابدی عمومی دین ہے، ہزاروں شاخوں میں بٹا ہوا۔ ہزاروں صورتوں میں ڈھلا ہوا ہے۔ مگر اس کی جامع ترین شاخ اور مکمل ترین صورت اسلامِ محمدیؐ ہے جو ظہورِ محمدیؐ کے ساتھ ساتھ نمودار ہوا جو آج تک چلا آرہا ہے اور جو ہمیشہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔

اسلامِ محمدیؐ چونکہ تمام ربانی ادیان اور تمام ربانی حکمتوں کا مجموعہ ہے کافی اضافے کے ساتھ اس لئے وہ مسیحیت بھی ہے اور موسویت بھی ابراہیمیت بھی ہے اور نوحیت بھی داؤدیت بھی اور سلیمانیت بھی شیثیت بھی ہے اور آدمیت بھی۔ ویدیت بھی ہے اور اوستائیت بھی۔ کنفیوسشیت بھی ہے اور تاؤیت بھی اور اسی طرح ہر دین اور ہر مذہب ہر ملت اور ہر حکمت بھی۔ اس لئے اس پر ایمان تمام ربانی ادیان و حکم پر ایمان ہے۔ اور اس کی

پیروی تمام ادیان و حکم کی پیروی ہے ۔ پس ضابطۂ محمدیؐ یا اسلامِ محمدیؐ پر ایمان لاؤ، تاکہ تمام ربانی ادیان و حکم پر ایمان کی طرف سے کفایت و کفالت ہو جائے۔ اور ان سب کی سعادتوں اور برکتوں کی طرف سے طمانیت و فراغت مل جائے ـــــ ـــــ اور اس لئے اسلامِ محمدیؐ کا کفر تمام ربانی ادیان و حکم کا کفر ہے۔ پس اس کے کفر سے بچو تاکہ سب کے کفر سے بچ سکو ـــ ضابطۂ محمدیؐ پر بھی ایمان لاؤ۔ اور اس کو برتو۔

صحیفۂ محمدیؐ یا قرآن

(۱) صحیفۂ محمدیؐ کیا ہے؟ قرآن ان صحیح حدیثوں کے ساتھ جو قرآن کے اس مطلب اور منشا کو ظاہر کرتی ہیں جو خود حضرت محمدیتؐ کے ذہن مبارک میں تھے۔ قرآن کو [illegible] صحیح حدیثوں کے مانو اور پہچانو۔ اور پہچانتے رہو اور برتو اور برتتے رہو ـــ مگر قرآن [illegible] اعلیٰ علم و عرفان حدیثوں کے علم و معرفت کے ساتھ بھی میسر نہیں آ سکتا جب تک اس کے چار عناصر و پنج ارکان معرفت کو حاصل نہ کر لے ـــ چار عناصر معرفت قرآن کے یہ ہیں۔ تمام صحائف الٰہی مسلمۃ و اد عاییۃ۔ تمام حکمتی و تمدنی علوم و فنون [illegible] ان میں علوم الاسرار بھی اپنی تمام شاخوں کے ساتھ شامل ہیں۔ تمام نقلی و استنباطی علوم و فنون۔ تمام صنعاتی و ریاضی علوم و فنون۔ پنج ارکانِ معرفت قرآن کے یہ ہیں۔ تعلیم ربانی، تنزہ ربانی، تعبد ربانی، توجہ ربانی تفکر ربانی ـــ اگر قرآن کے اعلیٰ معرفت کو [illegible] حاصل کرو تو ان ارکان معرفت کو اور ان عناصر معرفت کو ضرور حاصل کرو۔ البتہ بقدرِ ضرورت معرفت ہر طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ ـــ چونکہ قرآن کی معرفت ہی اسلام محمدیؐ کی معرفت ہے۔ اس لئے اسلام کی اعلیٰ معرفت بھی انہیں عناصر و ارکان معرفت کا محتاج ہے ـــ [illegible] خارجی اسباب معرفت کے ساتھ ساتھ ایک باطنی سامانِ معرفت بھی درکار [illegible] ہے اور وہ [illegible] الاصول ہے باقی سب فروع و معاونات [illegible] اور بس۔ یہاں تک کہ اگر [illegible] کمال [illegible] مقبول بن جائے تو تمام خارجی لوازم معرفت سے جو مذکور ہوئے ہیں ایک [illegible] ہو سکتی ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ معرفت الٰہی مع قلبِ سلیم و ذہنِ مستقیم، [illegible] بادیہ و نسبت قائمہ و [illegible]

الہامات نہیں تو واردات و انکشافاتِ قلبی و روحی کی قطعی جاذب ہو جو اولاً انبیا کا مقام ہے۔ ثانیاً اولیاء و حکماء ربانیین کا ہے ـــ اور حق یہ ہے کہ تفسیر قرآن اور تشریح اسلام کا حق صرف ان ہی تین گروہوں کا حصہ ہے۔ ان کے علاوہ جو لوگ اس وادی میں قدم رکھتے ہیں، جھک مارتے ہیں۔ دوسروں کو نقل و اخذِ تفسیر و تشریح کے سوا اور کچھ حق حاصل نہیں ہے۔ کاش وہ خود پر رحم کریں اور دوسروں پر ترس کھائیں ـــ اسلام محمدی اور قرآن کی حیثیت کی بابت ایک بنیادی نکتہ جاننا بنیاداً ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلام محمدی اور قرآن ایک محدود دستور اور ایک محدود صحیفہ نہیں ہیں جن کو ایک شخص یا ایک گروہ یا ایک علم اور ایک کتاب یا ایک جگہ اور ایک زمانہ یا ایک توجہ اور ایک رجوع کلیتہً سمجھ کر اور کھول کر رکھ دے اور وہ ہمیشہ کے لیے اور سب کے واسطے کافی و وافی ہو۔ وہ تو ایک کلی ذہنی کائنات مسلسل ہیں جو کلی خارجی کائنات مسلسل کی مکمل علمی تعبیر و تفسیر ہیں جن میں پوری خارجی کائنات مسلسل کی بیان اور نچوڑ بن کر کھنچ آئی ہے۔ جس کے لیے قرآن نام کا صحیفہ سی پارہ اور اسلام نام کا علم و آئینِ مذکور و متداول ماخوذ از قرآن سی پارہ صرف تصویرِ اصغر اور علامت یا پیکر کا حکم رکھتا ہے اور بس جیسے کہ پورے کرۂ زمین کے لیے اس کی پاکٹ جغرافی تصویر ـــ لیکن وہ اس لیے ہے کہ انہیں دیکھ کر حقیقی اسلام محمدی اور حقیقی قرآن کی جن کا پھیلاؤ پوری اصلی کائنات مسلسل پر پھیلا ہوا ہے یاد آ جائے اور اسکی طرف ذہن راجع و متوجہ ہو جائے۔ تب ان کی تشریح و تفسیر یقیناً نا محدود تشریح و تفسیر ہے جو ازل سے چلی آ رہی ہے اور ابد تک چلی جائے گی اور کبھی ختم نہ ہوگی۔ ہر نیا زمانہ نئی تفسیریں اور تشریحیں پیش کرے گا ہر نیا علم نئی توضیحیں اور تنقیحیں لائے گا اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا ـــ اسلام صرف ذہنی مفہومات و مطالب کا نام بھی نہیں ہے۔ وہ اسلام کی صرف تعبیرات و تفہیمات ہیں۔ اسلام ان فطری، خارجی، اصولی، کلی حقائق کا نام ہے جو خارج میں خارجی موجودات کے ساتھ لپٹے ہوئے پوری خارجی کائنات میں کارفرما کرتے رہتے ہیں

جن کو قوانین قدرت اور اصولاتِ فطرت بھی کہتے ہیں۔ انہیں قوانین خارجی اور اصولاتِ حقیقی سے وہ مفہومات و مطالب اخذ کیے گئے ہیں جن کا نام غلطی سے اسلام پڑ گیا ہے حالانکہ وہ اسلام نہیں ہیں، اسلام کے صرف عنوانات ہیں۔ اسی طرح قرآنِ اصلی وہ کتاب نہیں ہے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے نہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ کتاب تیار ہوئی ہے یا جو اس کتاب سے سمجھ کر بولے جاتے ہیں۔ نہ وہ معنی و مطالب ہیں جو اس کتاب سے ذہن میں آتے ہیں، بلکہ قرآن اصلی صحیفۂ فطرت کا نام ہے جو غلافِ کائنات میں چھپا ہوا ہے اور اس سے آگے ذاتِ حضرتِ الوہیت میں اس کی صفتِ علم کے اندر مندمج ہے۔ جس کے ایک عکس سے صحیفۂ فطرت بن کر تیار ہوا اور لفافِ کائنات میں ملفوف ہوا۔ اور دوسرے عکس سے زبانِ جبرئیل پر جامۂ لفظ بن کر نمودار ہوا اور وہاں سے زبانِ محمدیؐ پر جاری ہوا اور وہاں سے کتابی صورت میں منتقل ہوا ——— اگر اسلامِ محمدیؐ اور قرآن کی بابت یہ نکتہ تمہارے ذہن میں جم رہا اور وہ قلبِ سلیم اور ذہنِ مستقیم تمہارا ساتھ دیتا رہا جو ہر حقیقت اور ہر حکمت کے قبول کے لئے تیار رہتا ہے۔ جو اس پر فکرِ سلیم یا القاءِ قدیم کی طرف سے وارد ہو یا کسی سُنانے والے سے سُنا جائے اور بتانے والے سے جانا جائے یا کسی دوسرے ذریعے سے معلوم کیا جائے وہ حقیقت اور وہ حکمت خواہ کسی قدرتی اور انوکھی ہو اور کہیں سے کبھی وقت آئی ہو اور جب اور جس حالت میں ملی ہو تو تم یقیناً اسلامِ محمدیؐ اور قرآن کی فہمِ حقیقی کے لائق ہو اور اس کے علمِ اعلیٰ کے مستحق ہو اور صرف تمہیں لائق اور مستحق ہو۔ دوسرا کوئی نہیں ——— اس بنیادی نکتے کے ساتھ ساتھ یہ تکمیلی نکتہ بھی تمہارے ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اسلام محمدیؐ اور قرآن۔ بے علم و آئین کا انتہائی مآل اور منتہائی کمال، وحدت و کاملیت ہے۔ ان کا منشاءِ آخری کثرت میں وحدت پیدا کرتے رہنا اور کثرت سے وحدت کی طرف کھینچتے رہنا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ جہالت معرفت سے اور ناقصیت کاملیت سے بدلتی رہے اور اسی لئے وہ انتشار سے بھی ہٹاتے رہتے اور ارتقا کی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ اسی وحدت و کاملیت اور ارتقائیت و عروجیت کو

کو مرکوزِ خاطر کرنے کے لئے اور مطلوبِ وجدان بنانے کے لئے وہ حضرتِ اُلوہیت کو اس کے نقشۂ کمال کے ساتھ معیارِ کمالی بناکر بہ تکرارات و اصرارات مسلسل و متواتر پیش کرتے رہتے ہیں اور پکارتے رہتے ہیں کہ ادھر دیکھو اور دیکھتے رہو اور بڑھو اور بڑھتے رہو۔ اور چونکہ یہ ذاتِ علیا نامحدود و لامتناہی ہے اس لئے بے رُکے اور بن تھکے لامحدود و نامتناہی دکھائی اور بڑائی کے ساتھ مسلسل دیکھتے رہو اور مسلسل بڑھتے رہو ——— پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کی مخلوق کائنات کو بھی جو اس کا خارجی آئینۂ نمائش ہے اس کی لامحدودیت کے ساتھ پیش کرتے رہتے ہیں اور تاکید کرتے رہتے ہیں کہ اس آئینے کو بھی سمجھو۔ اس آئینے میں بھی جھانکو۔ مگر اس ارادے سے اور اس ڈھنگ سے کہ اس میں تجلی کرنے والی صورت کا تماشہ کرسکو ——— پھر وہ یہ بھی ساتھ ساتھ بتاتے رہتے ہیں کہ اے انسان تو خلیفۃ اللہ ہے پس تو بھی نامحدود و لامتناہی ہے۔ تیری ترقی نامحدود و لامتناہی ہے۔ تیری معراج انسانیت نہیں ہے، تیری معراج اُلوہیت ہے۔ جیسا کہ حضرتِ اُلوہیت کی معراج اُلوہیت نہیں ہے، حضرتِ اُلوہیت کی معراج ربّیت ہے ——— انسانیت تو تیری ابتدائیت ہے جیسا کہ اُلوہیت حضرتِ اُلوہیت کی ابتدائیت ہے ——— تب انسانیت پر قناعت نہ کر، اُلوہیت تک پہنچ ——— کیونکہ تو خلیفۃ اللہ ہے۔ جیسا کہ حضرتِ اُلوہیت اُلوہیت پر قناعت نہیں کرتی، ربّیت تک پہنچتی ہے ——— التوائی مت بن اور انسانیت پر ٹھٹک نہ رہ، ارتقائی بن اور اُلوہیت کی طرف بڑھتا رہ جیسا کہ حضرتِ اُلوہیت التوائی نہیں ہے ارتقائی ہے۔ اُلوہیت پر رُکی نہیں رہتی ربّیت کی طرف چلتی رہتی ہے۔

عملیّات

حقائقیاتِ عملیاتی

(۱) زندگی عملیت کو بھی چاہتی ہے جیسا کہ اعتقادیت کو چاہتی ہے۔ اعتقادیت اور عملیت زندگی کے دو بازو ہیں۔ زندگی ان دونوں بازوؤں کے سہارے ہی اُڑنے والی بن سکتی ہے۔ ان دونوں کے مجموعے کے بغیر خواہ وہ دونوں نہ ہوں، خواہ ایک نہ ہو، لوتھ ہے اور لوتھ ہو کر رہ جاتی ہے۔ پس دونوں بازو مہیا رکھو تاکہ اُڑے اور اُڑتی رہے۔ اعتقادیت اور عملیت آپس میں بھی ربط اور رشتہ رکھتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں اگرچہ تم ان کی اس چاہ اور ڈھونڈھ کو محسوس نہ کر سکو۔ اعتقادیت، عملیت کے بغیر اپاہج ہے۔ عملیت اعتقادیت کے بغیر اندھی ہے۔ وہ لوگ سخت فریب میں ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا رکھنے پر راضی ہیں، پھر یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی اُڑنے والی بن سکے گی۔ اس طرح اُڑنے والی تو نہیں بن سکے گی۔ ہاں اُڑنے والی ضرور بن سکے گی۔ اس فریب سے دُور رہو۔

(۲) عمل بھی ایک قانون رکھتا ہے۔ جس کو قانونِ عمل کہتے ہیں جیسا کہ اعتقاد ایک قانون رکھتا ہے۔ جس کو قانونِ اعتقاد کہنا چاہیئے۔ قانونِ عمل اتنا وسیع ہے کہ کل کائنات ہی نہیں، کل موجودات اس کے تحت آجاتا ہے۔ جس میں فرش سے عرش تک، مادّہ سے روح تک کوئی مستثنیٰ نہیں بلکہ خلق سے خالق تک کوئی آزاد نہیں۔ خالق قانونِ عمل کا محکوم اور اس کے اُوپر مجبور تو نہیں ہے، پھر بھی پابند تو ضرور ہے اور اتنا پابند ہے کہ خلق اُس کی پابندی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خلق تو اونگھ اور نیند میں یعنی سستی اور نادرستی میں پڑی رہ سکتی ہے اور پکڑی جاتی رہتی ہے خالق کو نہ اونگھ ہے نہ نیند۔

(۳) قانونِ عمل جزا اور اثر کی رکھ ... اور ... رکھتا ہے۔ کوئی عمل

نہیں جو جزا اور اثر سے خالی ہو۔ قانونِ عمل قانونِ جزا کو مستلزم ہے اور مستعقب ہے۔ قانونِ جزا قانونِ عمل کے پیچھے ہی پیچھے لگا چلتا ہے — یہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ کہ عمل آج اور ابھی، جزا کل اور کبھی۔ مثلاً عمل دنیا میں نقد، جزا آخرت میں اُدھار۔ بلکہ یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ عالمِ آخرت عالمِ دنیا سے اور پرے ہے، عالمِ آخرت عالمِ دنیا کے ساتھ ساتھ ہی ہے — ہر عمل کا شروع دنیا ہے انجیر آخرت ہے — یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ صرف عالمِ دنیا عالمِ عمل ہے، عالمِ آخرت عالم بے عملی ہے۔ بے عملی موت ہے۔ عالمِ آخرت عالمِ موت نہیں ہے عالمِ حیات ہے، پھر عالمِ حیاتِ عالیہ ہے — کیا حضرتِ الوہیت عالمِ آخرت میں نہیں رہتی ؛ اگر رہتی ہے اور ضرور رہتی ہے تو کیا وہاں اس کو اونگھ اور نیند پکڑ لیتی ہے اور اس وجہ سے بے عمل بن جاتی ہے۔ نہیں — پھر کیا عالمِ آخرت کی ہستیاں حضرتِ الوہیت سے بے رابطہ ہو جاتی ہیں اور جنت میں صرف اونگھا کرتی ہیں یا جہنم میں صرف چیخا کرتی ہیں اور قدرت و رحمتِ الٰہی مردہ مشیتِ الٰہی کی مردہ آغوش میں منہ لپیٹے سوتی رہتی ہیں۔ ایسا تو نہ ہوگا ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ ہوگا یہ اور یہی ہو سکے گا کہ قدرتِ الٰہی جنتیوں کو نئے مراحلِ ترقی میں کھینچتی رہے گی جو جنت سے بھی حضرتِ الوہیت تک لامتناہی ہیں اور اس لیے، جنتیوں کی ترقی لامتناہی ہوگی۔ اور کیا ترقی کا عمل عمل نہیں ہے۔ پھر رحمتِ الٰہی جہنمیوں کو جہنم سے نکالے گی اور جنت کی طرف کھینچے گی، پھر انہیں بھی حضرتِ الوہیت کی طرف ہنکائے گی۔ اور کیا جہنم سے جنت کی طرف چلنا اور اس کے لیے تیاریاں کرنا بے عملی ہے — البتہ عمل کا جو محدود تصور ذہنوں میں سما گیا ہے اور اس کا جو محدود نقشہ دماغوں میں قائم ہو گیا ہے اس سے الگ ہے یہ عمل مگر عمل ہے۔

(۴)۔ ہر عمل اپنی ایک جزا رکھتا ہے خواہ وہ دنیا میں ہو خواہ آخرت میں۔ بد عمل بد جزا رکھتا ہے، نیک عمل نیک جزا رکھتا ہے — یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی عمل جزا سے بالا ہو جائے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ بد عمل نیک جزا پائے یا نیک عمل بد جزا سے دوچار ہو جائے۔ ایسا ہونا قانونِ الٰہی کی شکست ہے۔ قانونِ الٰہی کبھی شکست نہیں کھا سکتا

کون اس کو شکست دے گا۔ کیوں وہ شکست کھائے گا ــــ اصولِ مغفرت بھی بیشک ایک چیز ہے۔ اس سے انکار بھی حقیقت کا انکار ہے۔ دعوائے الٰہی کا انکار ہے۔ کفر ہے لیکن اصولِ مغفرت، قانونِ جزا کو توڑنے کے لئے نہیں ہے جوڑنے کے لئے ہے۔ وہ اسے توڑتا نہیں ہے جوڑتا ہے۔ اصولِ مغفرت یہ نہیں کرتا کہ عمل کو بے جزا کر دے یا بدعمل کو بدجزا سے دور رکھ دے۔ یہ ظلم ہے، قانونِ الٰہی ظلم سے دور ہے۔ حضرتِ الوہیت ظلم سے پاک ہے۔ یہ قانونِ الٰہی کی شکست ہے، قانونِ الٰہی شکست کے لئے نہیں ہے ــــ اصولِ مغفرت صرف یہ کرتا ہے اور رحمتِ الٰہی کے ماتحت کرتا ہے کہ ایک بری جزا کو دوسری بری جزا سے بدل دیتا ہے۔ دوسری بری جزا کیا ہے؟ ندامت۔ یہ بری جزا ایک اور بری جزا سے بچا دیتی ہے۔ اس کا نام عذاب ہے۔ پھر یہ تبدیلی بھی بے آئین نہیں ہے نہ قانونِ عمل سے باہر ہے۔ یہ تبدیلی بھی کسی خاص نیک عمل ہی کی جزا ہوتی ہے مفت نہیں ہوتی۔ فضل بھی بلا وجہ اور خارج از قانونِ عمل نہیں ہے۔ فضل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت مغفرت ہے۔ اس صورت میں تو اس کا ماتحتِ قانونِ عمل ہونا ظاہر ہی ہے۔ دوسری صورت ثوابِ زائد کی ہے، ثوابِ زائد بھی ہمارے حساب سے بے معاوضہ ہے حقیقت میں بے معاوضہ نہیں ہے۔ وہ بھی کسی خاص نیک عمل کا معاوضہ ہی ہے۔

(۵) ــ عمل دو قسم کے ہوتے ہیں نیک عمل جسکو نیکی کہتے ہیں۔ بدعمل جسکو بدی کہتے ہیں ــ نیک عمل میں بھی بڑی بڑی باریکیاں اور باریک صورتیں ہیں جن کی عملی معرفت، عملی نگہداشت عملی احاطگی سخت مشکل بات ہے۔ بدعمل میں بھی بڑی بڑی باریکیاں اور باریک صورتیں ہیں جن کی عملی معرفت عملی نگہداشت عملی دورواری سخت مشکل چیز ہے اگرچہ ان کا بیان دینِ الٰہی میں ذرہ برابر چھوڑا نہیں گیا اور اس لئے ان کے واسطے حجت تمام ہے۔ پھر بھی ان کا عملی لحاظ ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس مشکل کے دو علاج تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ انسان کے کرنے کا علاج استغفار و انفال ہے۔ مغفرت مانگتے رہنا اور نفلی نیکیاں کرتے رہنا۔ یہ دو زوائد نیکیاں ان تقصیروں کا کفارہ

بن جاتی ہیں جو باریک ضروری نیکیوں کی چھوٹ اور باریک بدیوں کی لپیٹ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوسرا علاج جو خود حضرتِ اُلوہیت کے ہاتھ ہے، فضل ہے، جو عوض ہے تمہارے استغفار و انفعال کا۔ اور صفت نہیں ہے، بے قاعدہ نہیں ہے، لاأُبالیانہ نہیں ہے اس ضابطے کا بھی لحاظ رکھو۔ زندگی کو اس ضابطے کے مطابق باضابطہ بناؤ۔ اس دھوکے کے پاس بھی مت پھٹکو کہ کارخانۂ الوہیت ذرّہ برابر بھی بے ضابطہ ہے۔

اعمالیّات

ربوبیّات۔ حیاتیّات۔ ربوبیّتِ حیات

حقائقیاتِ حیاتی | حیات وہ حالت ہے جو حقیقت کو قائم رکھتی ہے۔ اگر حسی ہے تو حس ہی کرتی ہے ورنہ نہیں۔

(احوالیات)

ربوبیّتِ حیات۔ تحفّظِ حیات | تحفّظِ حیات فرض ہے۔ تحفّظِ حیات کو فرض مانو۔ ربوبیتِ حیات کی پہلی شاخ تحفّظِ حیات ہے۔

(۱)۔ حیات (زندگی) سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز ہے۔ حیات ہی کے لئے دین ہے۔ حیات ہی کے لئے تہذیب ہے۔ ترقی ہے۔ تکمیل ہے۔ سعادت ہے، برکت ہے، نعمت ہے۔ حیات ہی نہیں تو پھر آرائشیں کیا؟ ــــ تب پہلی توجہ حیات پر پھر دوسری چیزوں پر ــــ حیات کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ حفاظت صرف یہ نہیں ہے کہ وہ جوں توں بچی رہے۔ حفاظت یہ بھی ہے کہ اس کو قوی اور شگفتہ بنایا جائے۔ حیات اگر اسی طرح بچی رہی کہ موت کو بھی اس پر رحم آتا رہا تو اس بچاؤ سے تو مٹاؤ ہی بہتر ہے۔ حیات ایسی تو ہو کہ موت کو بھی اس کے مٹانے میں دُکھ محسوس ہو۔ حیات کو ایک مضبوط چٹان کی مانند تو بنانا چاہیے جس پر بلائیں اور مصیبتیں سر ٹکراتی رہیں۔ اور جھک مار مار کر ٹوٹ جاتی رہیں، پھر حیات کو ایک

جنگلی گلاب پھول کی طرح تو ہونا چاہیئے۔ جو لہک لہک کر گردو پیش کو لہکاتا رہے۔ اور مہک مہک کر ماحول کو مہکاتا رہے۔ یہ کیا کہ بن کھلی افسردہ کلی بنی بنی گھٹی پڑی رہے۔ نہ خود لہکے نہ دوسروں کو لہکائے۔ نہ خود مہکے نہ دوسروں کو مہکائے۔ پس حیات کی حفاظت کرو۔ اور اس طرح کی حفاظت کرو کہ وہ طاقت اور شگفتگی کا لہراتا ہوا چشمہ بنا رہے۔ اور یاد رکھو کہ اس سے غفلت بنیادی گناہ اور سب سے بڑا گناہ ہے جو ساری نیکیوں کے باوجود عذاب الٰہی کا نشانہ بنا چھوڑتا ہے۔ اور جہنم پہنچائے بغیر نہیں مانتا۔ پھر تحفظِ حیات میں تحفظِ حیات خود ہی فرض نہیں ہے تحفظِ حیاتِ غیر بھی فرض ہے۔

(۲)۔ فرض تحفظِ حیات انجام دینے کے لئے ضابطہ حفظانِ جسمانیت کی پابندی کرو جس شدت سے ضابطہ حفظانِ روحانیت کی پابندی کر سکتے ہو۔ اور یقین رکھو کہ جس طرح ضابطہ حفظانِ روحانیت کی شکست جہنم میں بھیجے گی ضابطہ حفظانِ جسمانیت کا نقص بھی جہنم سے اُوپر نہیں رہنے دے گا۔۔۔

حیات کا روحانی بقا و ارتقا حضرتِ الوہیت کو جتنا محبوب و مطلوب ہے، حیات کا جسمانی بقا و ارتقا بھی اتنا ہی محبوب و مطلوب ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جسم کو نہ پیدا فرماتا۔ تمہارے وجود کو جسمانی نہ بناتا۔ تمہیں جسم نہ دیتا فقط روحانی بناتا۔ فقط روح دے کر رہ جاتا۔ پھر کُلُوا وَاشْرَبُوا۔ تمتعوا۔ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ۔ کے احکام نہ سُناتا ـــــ یاد رکھو کہ دین کا پہلا باب احکام، ضابطہ حفظانِ جسمانیت ہے۔ اس کے بعد دوسرے ابوابِ احکام ہیں تم نادانی سے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کو پہلا حکم سمجھنے لگے ہو۔ پہلا حکم اقیموا الصلوٰۃ نہیں ہے۔ پہلا حکم کُلُوا وَاشْرَبُوا ہے۔ پھر تم نے سنا ہے یا نہیں کہ ایک نفس کو قتل کرنا خلود جہنم کی سزا والا گناہ ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ نفس چاہے خود تمہارا ہو چاہے دوسرے کا ہو ـــــ ضابطہ حفظانِ جسمانیت کی پابندی کے لئے ضابطہ حفظانِ جسمانیت کا علم و اعتقاد بھی ضروری ہے۔ پس اس کا علم و

ایمان بھی حاصل کرو۔ اسی شغف سے جس شغف سے ضابطۂ حفظانِ روحانیت کا علم و ایمان حاصل کرتے ہو، یہ یقین کرتے ہوئے کہ دین احکامی لحاظ سے برابر برابر کے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ حفظانِ جسمانیت کا ضابطہ پیش کرتا ہے۔ دوسرا حصہ حفظانِ روحانیت کے ضابطے پر مشتمل ہے۔ اگر حفظانِ روحانیت والے حصے کو مانا اور حفظانِ جسمانیت والے کو نہیں مانا، تو آدھے دین کو مانا آدھے دین کا انکار کیا۔ دین کا انکار کفر و فسق ہے۔ اگرچہ ایک شوشے کا ہو۔ پس کفر کیا اور کافر ہو گئے اگر ایمانی انکار کیا ہے۔ اور فسق کیا اور فاسق ہو گئے اگر عملی انکار ہے ـــ فسق تقویٰ ہی کی شکست کا نام نہیں ہے۔ فسق ہر حکم الٰہی کی شکست کا نام ہے ـــــــ ضابطہ حفظانِ جسمانیت تین بنیادی شاخیں رکھتا ہے۔ ایک شاخ ضابطہ حفظانِ بقائیت ہے۔ اس شاخ کو سکھانے والا علم علمِ معیشت کہلاتا ہے۔ پس علمِ معیشت بھی علمِ دین کا جزو ہے۔ علمِ معیشت کی تحصیل بھی فرض ہے۔ جو علمِ معیشت کا عالم نہیں علمِ دین کا عالم نہیں، جو معیشت کا عامل نہیں دین کا عامل نہیں۔ دوسری شاخ ضابطہ حفظانِ صحت ہے۔ اِس شاخ کی ہدایت کے لئے جو علم وضع کیا گیا ہے وہ علمِ طب کہلاتا ہے۔ پس علمِ طب علمِ دین کی شاخ ہے۔ علمِ طب کی تحصیل علمِ دین کی تحصیل ہے۔ پس علمِ طب کی تحصیل فرض ہے۔ علمِ طب علمِ دین کے نصابِ تعلیم کا جزو ہے جس نے علمِ طب کی تحصیل نہیں کی علمِ دین کی تحصیل نہیں کی۔ جو علمِ طب کا عالم نہیں علمِ دین کا عالم نہیں۔ جسطرح کہ وہ جس نے علمِ طب کی تعمیل نہیں کی دین کا عامل نہیں ـــــ تیسری شاخ ضابطہ حفظانِ قوت ہے۔ اس شاخ کی ہدایت دینے والا علم، علم الریاضت ہے۔ پس علمِ ریاضت بھی علمِ دین کی شاخ ہے اور اس کا بھی بجنسہٖ وہی مرتبہ ہے۔ جو علمِ دین کی روحانی شاخ کا مرتبہ ہے۔ اور علمِ معیشت اور علمِ طب کے مرتبے ہیں ـــــ پھر ان شاخوں کی شاخیں ہیں، پھر ان شاخوں کی شاخوں کی شاخیں ہیں، اور اسی طرح بہت دور تک ـــــ ان شاخ در شاخ شاخوں کا بھی وہی

حکم ہے علم اور عمل کے اعتبار سے حیثیت اور شان کے معاملے میں جو ان بنیادی شاخوں کا ہے اور جو علم دین کی روحانی شاخ کا ہے یعنی ان سب کی تحصیل فرض ان سب کی تعمیل فرض ان سب کا ایمان فرض ان سب کا عمل فرض ان سب کا علم علم دین کے نصاب تعلیم کا جز ان کا جو عالم نہیں علم دین کا عالم نہیں ان کا جو عامل نہیں دین کا عامل نہیں ———

ان سب شاخوں نے علم دین کی ہزاروں شاخیں کر دی ہیں۔ ان تمام شاخوں کو سمیٹنے کے بعد علم دین اتنا وسیع اور محیط ہو جاتا ہے کہ کوئی علم ربانی بھی خواہ وہ علم جسمانی کی صف میں ہو خواہ علم روحانی کی قطار میں ہو خواہ حکمت کا علم ہو خواہ معرفت کا علم ہو خواہ القا اور الہام کے ذریعہ ملا ہو خواہ فکر و اجتہاد کے ذریعے نکلا ہو اسکے حلقے سے باہر نہیں ہے۔ تب یہ تقسیم بالکل غلط تقسیم ہے کہ یہ علم دنیا ہے یہ علم دین ہے ——— نادانو! ہر علم علم دین ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ وہ علم ربانی علم ہو نفسانی علم نہ ہو۔ ربانی علم وہ علم ہے جو ربیت کا انکار نہ کرتا ہو اور ربوبیت کا فائدہ رکھتا ہو۔ نفسانی علم وہ ہے جو یا تو ربیت کا انکار سکھاتا ہو یا ربوبیت کا فائدہ نہ رکھتا ہو۔ علم نفسانی کو علم کفر بھی کہنا صحیح ہے اس معنے میں کہ وہ کفر و انکار کرتا ہے ربیت کے ساتھ یا ربوبیت کے ساتھ، تب یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ یہ علم دنیا ہے یہ علم دین بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ علم کفر ہے یہ علم دین یا یہ علم نفسانی ہے یہ علم ربانی۔ ——— تب سارا علم فلسفہ و حکمت نظری ہو خواہ عملی علم دین ہے الا صرف ان کے وہ مسائل اور دعاوی جو ربیت کو جھٹلاتے ہوں یا ربوبیت کو ٹھکراتے ہوں۔

(۳)۔ تحفظ حیات کے لئے ضابطہ حفظان حیات کا فقط علم کافی نہیں ہے اس کا عمل بھی ضروری ہے۔ عمل کی ایک شاخ ضروریات حیات کو مہیا کرنا ہے۔ کفایت اور قناعت کے درجے پر نہیں بلکہ فراغت اور وسعت کے درجے پر تاکہ حیات صرف قائم نہ رہے بلکہ قوی اور شگفتہ بھی بن سکے ——— ضروریات حیات کا تہیہ ضابطۂ الٰہی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ضابطۂ الٰہی کی ایک دفعہ اس باب میں یہ ہے کہ استعانت باللہ کو بھی جد و جہد کے ساتھ ساتھ جاری رکھو۔ اگرچہ اصل جد و جہد کو سمجھو کیونکہ قانون الٰہی نے جد و جہد ہی کو اصل ٹھہرایا ہے۔ استعانت باللہ صرف ضمیمہ ہے اور بس۔

(۴۲)۔ لیکن تحفظ حیات کے معاملے میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کو بھی نہ بھولو
دیکھو۔ انفرادی حیات کے تحفظ کے ساتھ ساتھ جماعت انسانی کی جماعتی حیات کے تحفظ کو بھی فرائض
میں شامل رکھو یعنی اپنے سامان ضروریات میں اسکا حصہ بھی لگاؤ۔ کیونکہ تم انفرادی نہیں پیدا کیے
گئے۔ اجتماعی پیدا کئے گئے۔ پھر ملوکیتی نہیں پیدا کئے گئے ربوبیتی پیدا کئے گئے۔ تب تمہیں
حق نہیں ہے کہ منفرد بسر کرو اور اپنے کسب اور سرمائے میں جماعت کو شریک کرو۔ جماعت کا کتنا
حصہ لگاؤ اور کس طرح ادا کرو۔ حصہ اتنا جتنا تمہاری فراغتی زندگی سے بچ جائے مگر فراغتی زندگی
سے نہ کہ تعیشی زندگی سے ۔ تعیشی زندگی تو اعتبار سے باہر ہے۔ جماعت کا حصہ جماعت کو دو
اسی طرح کہ جماعت کی جمعیتہ کو دو جسکو جمعیت بیت المال کے حوالے کرو۔ اگر جمعیتہ نہیں ہے
یا بیت المال نہیں ہے تو اشخاص کو دو یعنی حاجتمند اشخاص کو۔ مگر ساتھ ساتھ جمعیتہ پیدا کرنے
اور بیت المال قائم کرنے میں بھی لگ جاؤ۔ جب یہ چیز پیدا ہو جائے تب جماعت اور بیت
المال ہی کو دو ۔ پھر جب تک اشخاص کو دو تب تک یہی اجتماعی ہی ڈیلنگ میں دو۔ پھر ا
سمجھ کے ساتھ مت دو کہ وہ خیراتی ہیں حقیر ہیں ۔ اس سمجھ کے ساتھ دو کہ وہ حصہ دار ہیں عزت دار
ہیں، کیونکہ تمہارے جماعتی بھائی ہیں جنسی برادر ہیں جس کا سرمایہ تم نے جوڑا ہے وہ ان کا ہی لگا
اور ذمہ دار مالک ہے جس طرح تمہارا مالک ہے جس نے اسکی کفالت بھی اپنے ذمے لی ہے۔ جس نے تم
سب کی کفالت کا ایک ہی پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ خواہ ان میں کوئی کم کمائے یا زائد کمائے۔
البتہ محنت سب کی برابر ہو۔ اگر تم زائد کمائے تو اس لیے نہیں کہ تم نے زائد محنت کی بلکہ
اس لئے کہ تم زیادہ چالاک نکلے یا تم کو زیادہ سنہرے موقعے ملے۔ یہ دونوں صورتیں تمہارے
کسب کی تو ہین ہیں کہ ان پر اجر کی زیادتی ہو۔ مالک کے دین کی ہیں۔ پس اس کا کوئی
معاوضہ نہیں۔ معاوضہ صرف محنت پر ہے۔ محنت میں تم سب برابر۔ پس مالک کے سرمائے
میں بھی جو اتفاق سے تمہارے قبضے میں آگیا ہے حصہ سب کا برابر۔ ہاں ان اشخاص کو
مت دو جو محنت کا فرض نہیں ادا کرتے ۔ فرض ادا کئے بغیر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔
جو خود کو بھی ذلیل کرتے ہیں جماعت کو بھی مالک کو بھی۔ اگر یہ محنت کر ہی نہیں سکتے۔ اپاہج
ہیں۔ یا کوئی کام نہیں پا سکتے یا محنت کر رہے ہیں [illegible] اور وہ کمی برابر

انہی کے حصے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ وہ معذوری کے سبب مالک ہی کی طرف سے شرط سے مستثنیٰ کیئے ہوئے ہیں۔ اور مالک کے وظیفہ خوار ہیں مستقل وظیفہ خوار جیسے کہ اپاہج یا عارضی وظیفہ خوار جیسے بیکار ــــ جمع دولت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ لوٹ ہے خیانت ہے ظلم ہے تم سمجھے بیٹھے ہو کہ سرمایہ تمہارا ہے سرمایہ مالک کا ہے۔ اس نے کسی وجہ سے بھی تمہیں اس کا امین بنایا ہے۔ امینِ مال کو جامعِ مال بننے کا حق نہیں، قاسمِ مال بننا فرض ہے، اگر تم ایسا نہیں کرتے تو لٹیرے ہو، خائن ہو ظالم ہو اور اسکی تمہیں سزا ملے گی یہاں بھی وہاں بھی ــــ حاجتمند اشخاص کو اتنا ہی دو جتنا ان کی فراغتی زندگی کے لئے ضروری ہے نہ اس سے کم دو نہ زائد دو۔ اگر تمہارا سرمایہ تمہاری فراغتی زندگی سے زائد نہیں ہے تو کچھ بھی دینا دوسروں کو تم پر فرض نہیں ہے۔ تم چاہو تو ایک حبہ بھی کسی کو نہ دو۔ لیکن یہ فرض کا قانون ہے نفل کا قانون کچھ اور ہے۔ فرض کی راہ بیشک بند ہے مگر نفل کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ چاہو تو ایثار کی راہ پر چل سکتے ہو خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کی مدد کر سکتے ہو۔ اگر تم حاجتمند ہو تو سرمایہ داروں کے یہاں تمہارا بھی وہی حق ہے جو حاجتمندوں کا تمہارے یہاں حق ہوتا اگر تم سرمایہ دار ہوتے ــ دولت کمانے میں اور بیش از بیش کمانے میں کسر مت کرو البتہ دولت جمع کرنے سے اور دولت کو بیجا لٹانے سے پرہیز کرو۔ دولت کمانا منع نہیں ہے۔ دولت جمع کرنا اور دولت لٹانا منع ہے۔

تہذیبِ حیات

ربوبیت۔ حیات کی دوسری شاخ تہذیبِ حیات ہے۔ تحفظِ حیات کے بعد تہذیبِ حیات کا درجہ ہے۔ تہذیبِ حیات بھی فرض ہے۔ حیات ہو اور نامہذب ہو تو وہ ایسی ہی ہے جیسے مکان ہے۔ مگر گندہ ہے۔ پانی ہے مگر گدلا ہے۔ ہوا ہے مگر زہریلی ہے ــــ ایسی حیات تمہارے لئے بھی وبال ہوگی اور جماعت کے لئے بھی اور مالکِ حیات کو بھی ناپسند ہوگی۔ پس تحفظِ حیات کے ساتھ ساتھ تہذیبِ حیات کے بھی درپے رہو ــ تہذیبِ حیات کی دو کڑیاں ہیں۔ تزکیۂ حیات اور تکملۂ حیات۔ تزکیۂ حیات یہ ہے کہ حیات کو مزکّیٰ اور مُصفّیٰ رکھا جائے۔ ملوّث و مکدّر نہ رکھا جائے۔ تزکیۂ حیات کی دو شاخیں ہیں۔ ایک جسمانی تزکیۂ حیات دوسری روحانی تزکیۂ حیات۔ جسمانی تزکیۂ حیات جسمانی طہارت و صفا سے حاصل ہوتی ہے جس میں جسم اور متعلقاتِ جسم مثلاً لباس، مکان و اسباب دونوں کی طہارت و صفا شامل ہے۔ روحانی تزکیۂ حیات

تزکیۂ اخلاق، تزکیۂ احوال، تزکیۂ اعمال کی تین قسموں میں پھیلا ہوا ہے۔ عبادات اور ریاضات روحانی
ان تزکیوں کے وسائل ہیں۔ سنّت ایک وسیلہ ہے اور فرائض وسیلہ ہے۔ ان تینوں تزکیوں کو پورا کرو اور ان کو
پورا کرنے کے لئے عبادات و ریاضات روحانی کو بھی انجام دو ــــــ تکملۂ حیات یہ ہے کہ حیات کے
مقاصد و اغراض کو پورا کرو اور اس طریقے سے اس کے منشا و غایت کو مکمّل کرو۔ اگر تزکیۂ حیات
بلا تکملۂ حیات ہے تو اسکی مثال ایسی ہے جیسے آئینہ صاف کیا جائے مگر کبھی مُنہ نہ دیکھا جائے
ــــ تکملۂ حیات کے لئے پہلی چیز مقاصدِ حیات کا مقرر کرنا اور ربانی مقاصدِ حیات کا مقرر کرنا ہے
دوسری چیز حیات کو مقررہ مقاصدِ حیات میں مرکوز کر دینا اور مستعمل کرنا ہے۔ تکملۂ حیات کے
خلاف ہے مقاصدِ حیات نہ مقرر کرنا۔ یا نفسانی مقاصدِ حیات کو مقرر کرنا یا مقررہ مقاصدِ حیات
میں حیات کو مرکوز نہ کرنا یا مستعمل نہ کرنا ہے۔ ربّانی مقاصدِ حیات کیا ہیں وہ جو حیات کو کسی
طرح کا نقصان نہ پہنچائیں۔ اور نفع پہنچائیں دوسرے لفظوں میں وہ جو ربّیت اور ربوبیت
کے تقاضاؤں کو پورا کرتے ہوں اور ان کے خلاف نہ ہوں ــــ ربّانی مقاصد کلیاتی درجے میں
تین ہیں۔ ربوبیتِ خود، ربوبیتِ خلق، ربوبیتِ ربّیت۔ ربوبیتِ خود اپنے کو ترقی و تکمیل
کے رستے پر لگاتا ہے۔ ربوبیتِ خلق، مخلوق کو ترقی و تکمیل میں مدد دیتا ہے۔ ربوبیتِ ربّیت
حضرتِ ربوبیت کے ساتھ رابطۂ خود کو پختہ اور مکمّل کرتے رہنا ہے ــــ اس دھوکے میں مت
رہو کہ تحفظِ حیات ہی مقصد ہے۔ تحفظِ حیات مقصد نہیں ہے تمہید ہے۔ البتہ ناگزیر تمہید
جس کو چھوڑ کر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس دھوکے میں بھی مت پھنسو کہ تعیش و تفاخر
بھی مقصد ہے۔ حاشا و کلّا۔ تعیش و تفاخر مقصد نہیں ہے مسلک ہے اور اگر مقصد ہے تو
نفسانی مقصد ہے جو یکساں باہر ہے۔ کوئی نفسانی مقصد اس قابل کہاں کہ اس کو مقصدِ
حیات بنایا جائے۔ نفسانی مقصد مقصدِ حیات تو نہیں ہاں فنِ حیات البتہ ہو سکتا ہے۔ تعیش و
تفاخر نفسانی مقصد کیوں ہے؟ اسلئے کہ وہ انفرادیتِ خالصہ کے شگوفے ہیں۔ انفرادیتِ خالصہ
اجتماعیت کی دشمن ہے۔ اجتماعیت انسانیت کی غایتِ خلقت کا ایک ضروری شاخسانہ ہے اتنا ہی نہیں بلکہ
تقاضائے حقیقت کا بھی ایک ضروری شاخسانہ ہے انسان ہی سے پوری کائنات کا خلاصہ اور تمام موجودات
کا نچوڑ، لقب شدہ اپنی حقیقت ہی میں اجتماعی ہے۔ پھر انسان خلیفۃ اللہ ہو اور منصبِ خلیفۃ الالٰہیت پر

مامور ہے۔ خلیفۃ اللّٰہیت حضرتِ اُلوہیت کا پورا پرتو اور مکمّل نقل ہے۔ حضرتِ ربوبیت مکمل اجتماعی ہے کیونکہ وہ ربّ العالمین ہے۔ تب انسان بھی خلقتاً اجتماعی ہے۔ چاہے تصنّعاً انفرادی بن جائے ـــــ البتہ انسانی اجتماعیت بھی خالصۃً اجتماعیت نہیں ہے جیساکہ اُس کی انفرادیت خالصۃ انفرادیت نہیں ہے۔ دونوں تار و پود کی مانند ایک دوسرے میں بنے ہوئے ہیں۔ پس اجتماعیت کو بھی خالصۃ بنانا ایسا ہی غلط ہے جیسا انفرادیت کو خالصۃ بنانا۔ پس اجتماعیت کو بھی انفرادی الجہت رکھو۔ یعنی انفرادیت کی جہت کو بھی اس میں شریک رکھو تاکہ طریقۂ زندگی طریقۂ فطرت سے ہٹا ہوا نہ بن جائے اور وہ خسارہ گلے کا ہار نہ ہو جائے جو طریقِ فطرت سے ہٹنے کا لازمہ ہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ جماعت میں اتنا نہ ڈوب جاؤ کہ اپنے کو بھول جاؤ۔ اگر ایسا کروگے تو جماعت کے کام کے بھی نہ رہ جاؤگے۔ اپنے کو یاد رکھنا خود غرضی نہیں ہے۔ یعنی نفسانی خود غرضی نہیں ہے اس لئے کہ اپنے کو یاد رکھنا اگر اس طور ہے اور اس نیت سے ہے کہ جماعت کو واقعی نفع پہنچایا جائے اور اسکی حقیقی خدمت کی جائے تو یہ عین جماعت پروری ہے اور خود فراموشی سے بہتر ہے جو جماعت کی مجنونانہ خدمت تو کراتی ہے مگر ہوشمندانہ خدمت سے باز رکھتی ہے اور جماعت کے لئے کون خدمت مفید ہے۔ مجنونانہ یا ہوشمندانہ؟ ہوشمندانہ ! ـــــ خلاصہ یہ کہ ربّانی مقاصدِ حیات تین ہیں، ربوبیتِ خود، ربوبیتِ خلق، ربوبیتِ ربّیت۔ ان تینوں ربّانی مقصدوں کو مرکزِ توجہ بناؤ اور انہیں کی گہرائیوں میں غوّاصِ حیات کو غوطہ زن اور خزانہ برآور رکھو۔

ربوبیات۔ روحیات

حقائقیاتِ ربوبیتِ روحی | روح کو حقیقتِ روح اور اصلیتِ روح پر قائم رکھنا ربوبیتِ روحی ہے۔

(احوالیات)

ربوبیتِ روحی خلقی | (۱) ربوبیتِ حیاتی ہی کی مانند اور بالکل مانند اور ہم درجہ ربوبیتِ روحی بھی فرض ہے ـــــ ربوبیتِ روحی ربوبیتِ حیاتی سے الگ چیز ہے۔ گو ربوبیتِ حیاتی میں ربوبیتِ روحی بھی داخل ہے کیونکہ اس کا ایک جزء ہے۔ جیسا کہ ربوبیتِ جسمانی اس کا ایک جزء ہے۔ لیکن یہ ربوبیت

ربوبیت روحی جو جز ہے ربوبیت جسمانی کا اور ہے اور جس ربوبیت روحی سے یہاں بحث ہو رہی ہے اور ہے۔ پہلی ربوبیت روحی میں روح سے روح حیوانی مراد ہے۔ دوسری ربوبیت روحی میں روح سے روح علوی مراد ہے۔ ربوبیت حیاتی روح علوی کی ربوبیت لازمی سے سروکار نہیں رکھتی وہ اس کے بغیر بھی ہو سکتی ہے البتہ روح حیوانی والی ربوبیت ربوبیت حیاتی کا لاینفک جز ہے۔

(۲)۔ ربوبیت روحی علوی دو قسم ہے۔ ربوبیت روحی خلقی[1] ربوبیت روحی الٰہی[2]۔ ربوبیت روحی خلقی کی دو کڑیاں ہیں۔ تہذیب روح اور تکمیل روح۔ تہذیب روح کی بھی دو کڑیاں ہیں۔ تطہیر روح اور تقدیم روح۔ تہذیب روح یہ ہے کہ روح کو نفسانیت سے نکال کر ربانیت میں پہنچایا جائے۔ روح کے نفسانی حالات مٹا دیئے جائیں یا دبا دیئے جائیں۔ ربانی حالات پیدا کر دیئے جائیں اور رائج کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد روح کو معمولی سطحی درجے سے جس میں وہ جسم کا ایک عامل انتظامی ہے اور بس اس کا کام صرف انتظام جسم کرنا ہے جسمانی پہلو سے۔ اسکے سوا اور کچھ نہیں۔ آگے بڑھایا جائے اور عمیق و جوہری درجے تک پہنچایا جائے۔ جہاں پہنچ کر روح کی شان بدل جاتی ہے۔ عامل جسم سے عامل ذات بن جاتی ہے اور اپنی ذاتی ترقی و تکمیل کی دنیا میں سیر و طیر کرنے والی ہو جاتی ہے۔ روح پر پہلا عمل تطہیر روح کہلا سکتا ہے۔ دوسرا عمل تقدیم روح۔ تکمیل روح یہ ہے کہ روح کو ناسوتیت سے جو اس کا آغازی مقام ہے کیونکہ تعلق جسمی میں پھنسنے کے بعد سے، اٹھا کر جبروتیت سے طے کراتے ہوئے لاہوتیت تک جو اس کا تکمیلی مقام ہے پہنچا دیا جائے۔ پھر لاہوتی رنگ دینے اور خلیفۃ اللٰہیت کی شان دلوانے کے بعد اسکو دوبارہ ناسوتیت میں اتارا جائے اور یہاں لا کر خاص اور وسیع رنگ میں جس میں انفرادیت اجتماعیت سے اور شخصیت مجموعیت سے بدل جاتی ہے جسمانی نظم و نسق کی مہم از سر نو اسکے سپرد کیا جائے۔ جس مہم کو وہ اس بار نائبانہ حاکمانہ شان میں ہاتھ میں لے گی اور اسی شان سے سرانجام کرنے میں لگ جائیگی۔ اس طرح تکمیل روح قدرتاً دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک روحانی یا لاہوتی تکمیل روح دوسری جسمانی یا ناسوتی تکمیل روح۔

ربوبیت روحی الٰہی سے مراد اس روح کی نگہداشت و پرداخت ہے جو حضرت الوہیت کی ذات خاص کا بلا واسطہ پرتو خاص ہے جسکو روح الٰہی کا لقب دیا جاسکتا ہے جو انسان میں روح خلقی کے ساتھ منسلک رہتی ہے اس غرض سے کہ روح خلقی کی مخلوقی حیثیت کی نگہبانی کرتی رہے اور قہر فرمانروایانہ شان سے اسکی رہنمائی کرتی رہے مگر جابرانہ مرزا نروایانہ شان سے نہیں بلکہ بادیانہ فرمانروایانہ شان سے جو روح خلقی کو مجبور و معذور کرکے فرمانروائی نہیں کرتی بلکہ خود مختار رکھکر کرتی ہے جو انسان کے اندر یقین اور انا کا اصلی مصداق ہے یعنی وہی ہے جو اپنے کو میں کہتی ہے - وہی ہے جو انسان کے اندر رب کا درجہ رکھتی ہے اور اپنی ہی ربوبیت کرتی ہے - وہی ہے جو انسان کے اندر نیک و بد کا فیصلہ سناتی رہتی ہے - نیکی کی ترغیب اور بدی پر ترہیب کرتی رہتی ہے جو خود ہر انسانی عمل سے آزاد او ہر نتیجہ عمل سے بالاتر رہتی ہے جو نہ سزا پاتی ہے جو نہ جزا نہ بدراہ ہوتی ہے نہ نیک راہ جو معصوم فرشتے کی مانند معصوم ہے اور جو بلا عذر و نقص امر الٰہی کی تعمیل کرتی رہتی ہے ——— اسکی نگہداشت و پرداخت یہ ہے کہ اسکو مضمحل و مایوس ہونے نہ دیا جائے اسکی آواز اور ہدایت کو بند اور پابند نہ کردیا جائے -

معاشیات

<table>
<tr>
<td>(۱) ربوبیت حیاتی کا پہلا محل عمل معاشیات کا صیغہ حیات ہے جو جسمانی ضروریات حیات سے بحث کرتا ہے جو یہ بتاتا ہے</td>
<td>حقائقیات معاشی</td>
</tr>
</table>

اور جتاتا ہے اور اس کا انتظام و اہتمام سکھاتا ہے کہ جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے واسطے کمانا چاہیے اور خرچنا چاہیے یوں کمانا چاہیے اور یوں خرچنا چاہیے کمائی کو خرچنا چاہیے اور بڑھانا چاہیے اور یوں خرچنا اور بڑھانا چاہیے - اس مہم کے لیے تدبیروں کے نقشے بتاتا ہے اور انکے ضابطے سناتا ہے - جن کی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ اگر ان کو جانا جائے اور مانا جائے تو کامیابی اغلب اور خوشحالی اقرب ہو جاتی ہے اور نہ جانا جائے اور نہ مانا جائے تو ناکامی یقینی ہے اور بدحالی واجب ہو جاتی ہے ——— لہٰذا اگر ربوبیت حیاتی کا فرض ادا کرنا ہو اور اچھی جسمانی زندگی چلانی ہو تو صیغہ معاشیات کو سمجھنا چاہیے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے - اور برتنا چاہیے جیسا کہ برتنے کا حق ہے یہ سمجھ کر نہیں کہ دین و ایمان سے یہ الگ دنیا ہے جس دنیا پر دین کا کوئی تصرف

نہیں ہے یا اس میں اس کی طرف سے کوئی اہتمام و التزام نہیں ہو سوا اسکے کہ روحانی منافع
وضوابط و حالات و کیفیات کو نگہداشت میں رکھے اور اخروی لوازمات مغفرت و
نجات کو محفوظ و مسلّم بنانے کے لئے حلال و حرام کے تھوڑے سے تنزیہی احکام جاری کر دیئے اور چند
قواعد جاری کر دیئے اور بس یہ سمجھ کر کہ دین نے جس زور کا اہتمام و انتظام روحانیات کی تحفظ
و تزئین کے لئے صرف فرمایا ہے اسی زور شور کا اہتمام و انتظام جسمانیات کی نگہداشت و
پرداخت پر بھی خرچ فرمایا ہے اسکی نظر میں جتنی حرمت و وقعت روحانی سعادت و فوزیت
کو ہے بالکل اتنی ہی حرمت و وقعت جسمانی فراغت و فائزیت کو بھی ہو وہ جتنا رنج و غم
روحانی خسران و نقصان پر کرتا ہے اتنا ہی سوگ اور ماتم جسمانی نقصان و خسران پر بھی کرتا
ہے اسکو جتنی شدید آرزو اس بات کی بھی ہو کہ ایک انسان روحانی حیثیت سے مغفور و مقبول
ہو اتنی ہی شدید آرزو اس بات کی بھی ہو کہ ایک انسان جسمانی پہلو سے موفق و منصور رہے
تاکہ انسان اپنی ترکیب و تقویم کے اعتبار سے جامع حد کمال فوز و فلاح کا مالک ہو۔
اسکو یہ ہرگز پسند نہیں ہو کہ روح تو عرش پر اللہ کے ساتھ سیاری و دوامی قرب میں ہو۔
اور اسرار و انوار میں پیراکیاں اور ڈبکیاں لگا رہی ہو اور جسم صاحب فرش پر بھوک بھوک
چلا رہا ہو یا اور بھوک اور پیاس سے قوتیں کھو رہے ہوئے ہوں — اسکو جیسا ذات
و ریاضات طہارات و تقویٰ سے جتنی دلچسپی ہو اتنی ہی معاشیات اور دوسری
محکمہ جات جسمانیات سے بھی دلچسپی ہو۔ اسکا معاشی اور جسمانیاتی تصور صرف تنزیہی اور
سلبی نہیں ہے بلکہ تعمیری اور ایجابی بھی ہو اسکا معاشی اور جسمانیاتی ضابطہ صرف منفی
نہیں ہے بلکہ مثبت بھی ہو۔ اسکی معاشی اور جسمانیاتی ہدایت صرف اتنی ہی نہیں ہو کہ یہ نہ کرو
ورنہ روحانیت کے آبگینے کو ٹھیس لگ جائیگی بلکہ یہ بھی ہے کہ یہ کرو اور ضرور کرو ورنہ جسمانیت
کا شیشہ چور ہو جائیگا اور دونوں کی حکم عدولی پر یکساں ناراضی اور تعزیر پیش آتا ہے دونوں
کی حکم عدولی کے عوض میں خفگی الٰہی اور جہنم کی وعید پیش کرتا ہے۔ وہ بے نمازی۔ زانی شرابی
قاتل۔ سود خوار۔ غاصب کو بھی جہنم میں جھونکتا ہے۔ ناکارہ نکھٹو مفلس۔ ذلیل کو بھی جہنم
رسید کراتا ہے — یہ سمجھ کر دین کے معاشی ہدایات کو قبول کرو۔ اور بڑھو اور پوری جوش

خروش اور ولولہ و حوصلہ کے ساتھ معاشی فراغت و فوزیت کے لئے برتو تاکہ روحانی زندگی کی طرح جسمانی زندگی کو بھی بجنج و نفیس بنا سکو۔ اچھا کھا سکو، اچھا پہن سکو، اچھا رہ سکو، اچھا سہہ سکو، اچھا بڑھ سکو، اچھا کڑھ سکو۔ معلوم ہو کہ تمہارا بھی کوئی رب ہے اور وہ تم پر بھی ربوبیت صرف کرتا ہے۔ روشن ہو کہ تم بھی اس رب سے رشتہ رکھتے ہو اور اس رشتے سے نفع اٹھاتے ہو۔ ظاہر ہو کہ تم بھی انسانیت کا قدر و احترام کرتے ہو۔ اور اس کا اہتمام و احتشام بجا لاتے ہو۔ یہ کیا کہ خود کو بھی ذلیل کرو اور خدا کو بھی ذلیل کراؤ۔

احوالیات کسبیات

(۱)۔ دین کا پہلا حکم اعمالیات کے شعبے میں اور معاشیات کے صیغے میں یہ ہے کہ کسب معاش کرو یعنی معاش کماؤ۔ پر ذلیل اور حقیر کسب معاش مت کرو۔ معزز اور موقر کسب معاش کرو۔ یعنی زیادہ آمدنی والی اور باعزت آمدنی والی کسب معاش کرو۔ پھر باحوصلہ کسب معاش کرو، اولوالعزمانہ کسب معاش کرو اور زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر کرو۔ اس معاملے میں قناعت اور بلفظ دیگر دنائت کو مطلق راہ نہ دو کہ یہ بنیادی غلطی ہے اور پہلا گناہ کبیرہ ہے۔ بلکہ ازدیادیت اور ارتقائیت لامتناہیت سے کام لو۔ اس حد تک کہ اگر کونین کی کل دولت کو اکیلے سمیٹ لینے کا عزم شاہانہ رکھو۔ مگر اس نیت سے نہیں کہ قارون بنو گے اور فرعون و نمرود ہو جاؤ گے نعوذ باللہ و استغفر اللہ۔ یہ دوسرا گناہ کبیرہ ہے۔ مفلس اور لپست معاش کے بعد دوسرا جرم کبیر قارون اور فرعون ہے بلکہ اس نیت سے کہ جو کچھ کماؤ گے اس کو تنہا اپنے لئے نہیں کماؤ گے بلکہ جمعیت اور جماعت کے لئے بھی کماؤ گے اور پوری خلقت کے لئے کماؤ گے۔ اور جو کچھ بچاؤ گے تنہا اپنے لئے نہیں بچاؤ گے اور اپنے اوپر بے دریغ اور بے ضابطہ نہیں لٹاؤ گے۔ جمعیت اور جماعت کے لئے بھی بچاؤ گے اور اس پر بھی لٹاؤ گے اور بہاؤ گے۔ اپنے لئے اپنی صرف فراغتی زندگی کا حصہ جو حلال ہے اور واجب ہے۔ نہ کہ تعیشی زندگی کا حصہ جو حرام ہے اور گناہ ہے رکھ کر بقیہ کو جمعیت و جماعت کے نذر کرو گے۔ جبر و قہر سے نہیں، کراہیت و کلفت سے نہیں سوال اور درخواست پر نہیں، عرض و شکر سے، ضا و رغبت سے، پیش کش و عطیہ کے رنگ میں نظر کرو گے۔ یہ سمجھ کر نہیں کہ احسان کر رہے ہو۔ اور امتنان کا حق

رکھتے ہو نعوذ باللہ واستغفر اللہ۔ یہ سمجھ کر کہ حصہ داروں کا حصہ بانٹ رہے ہو اور
یہ یقین رکھ کر کہ اگر نہ بانٹو گے تو خائن غاصب ظالم بے ایمان اور جہنمی بنو گے۔ پھر حلال
اور پاک کسب معاش کرو اور ناپاک کسب معاش مت کرو۔

(۲) جس طرح یہ دین کا پہلا اعمالی حکم ہے اسی طرح یہ انسان کا پہلا اعمالی عمل ہے پس
اعمالیات کا افتتاح اسی عمل سے کرو۔ اور اعمالی دنیات کی پیروی یہیں سے چلاؤ۔
یہ نہ کرو کہ یہاں سے کود کر اور اسکو بن کئے اور بے برتے چھوڑ کر عبادات و روحانیات میں
پہونچ جاؤ بلکہ اسکو برتتے اور طے کرتے ہوئے وہاں پہونچو اور ان کے رنگ میں رنگ کر
اس عمل کو بھی ان کے رنگ میں رنگ دو۔ و ھذا ھو الصراط المستقیم

(۳) کسب معاش کو زیادہ سے زیادہ مثمر بنانیکی غرض سے اشتراک فی الکسب کے
اصول کو برتو اور تعاون فی الکسب کے قاعدے پر چلو۔ مگر اس طریق نازک کو کامیاب
رکھنے کے لیے اس ضابطے کا بھی پورا اہتمام کرو۔ جو اس کے لئے دین میں اور دین کی تفسیر
ضابطہ ہذا میں مقرر و مدون ہو چکا ہے۔ اگر اس طریق پر چلنے کی ہمت نہ ہو اور انفراد
فی الکسب ہی چلنا پڑے تب بھی اس طریق کو بالکل بھول نہ جاؤ اور اس کی پیروی کی
خواہش کو ضرور راسخ رکھو۔ پھر اس ضابطے کی بھی ضرور پابندی کرو۔ جو مطلق کسب معاش
کے لئے مقرر ہے خواہ انفرادی کسب معاش ہو۔ خواہ اجتماعی کسب معاش ہو۔

(۴) کسب معاش کو کامیاب اور اعلیٰ بنانے کے لئے ان بنیادی اوصاف ششگانہ کو
خوب ذہن نشین رکھو۔ معرفت، محنت، محبت، دیانت، استقامت، ارتقائیت۔
ارتقائیت سے مراد یہ ہے کہ کامیابی کے کسی مقام پر اکتفا نہیں۔ بڑھتے رہو اور بڑھتے رہو
ہل من مزید کا وظیفہ رٹتے رہو۔ ان ارکان ششگانہ کے ساتھ اس ضمیمے کو بھی جوڑ لو اور ہمیشہ
جوڑے رکھو۔ یہ ضمیمہ استعانت باللہ ہے۔ اللہ سے مدد مانگتے رہنا مگر اس کو موہوم برکت کا
موہوم نسخہ سمجھ کر نہ برتو بلکہ قطعی برکت کا قطعی نسخہ سمجھ کر برتو۔ مگر اس کو ضمیمے سے زائد کا درجہ
نہ دو۔ ورنہ یہ بورڈ مہلکہ ٹھہرے گا۔ استعانت باللہ کا ضمیمہ دو فائدے رکھتا ہے ایک برکت کا
دوسرے عبادیت کا یعنے وہ معیشت کو بابرکت بھی بنا دیگا اور عبادت بھی ٹھہرا دے گا۔

گویا ہم خرما و ہم ثواب۔

(۵) غلط کسبی بھی بے کسبی کی طرح حرام ہے۔ غلط کسبی وہ کسب ہے جو دین کے ضابطۂ کسب کے خلاف ہو۔

صرفیات

(۱) کسب کی طرح صرف کو بھی حکم دین سمجھ کر قبول کرو۔ دین میں جس طرح بے کسبی حرام الا یہ کہ جنون یا ضعف مضعف یا فقدان مفقد کا عذر حائل ہو۔ اسی طرح بے صرفی بھی حرام اور اس سے جو تجمع دولت پیدا ہوتی ہے وہ بھی حرام اور جن وجوہ سے بے کسبی حرام انہیں وجوہ سے بے صرفی بھی حرام۔ بے کسبی اسلئے حرام کہ وہ یا تو خودکشی کی طرف لے جاتی ہے یا گداگری کی جانب۔ خودکشی انسانیت کا اتلاف ہے اسلئے حرام۔ انسانیت استحفاظ کی چیز ہے نہ کہ اتلاف کی۔ گداگری انسانیت کی تذلیل ہے اسلئے حرام۔ انسانیت تعظیم کی چیز ہے نہ کہ تذلیل کی۔ بے صرفی اسلئے حرام کہ وہ بھی خودکشی یا گداگری کی طرف منجر ہوتی ہے جب اپنا نہیں خرچ کروگے تو یا دوسروں کا لوگے یہ گداگری ہے یا دوسروں سے بھی نہ لوگے تب مروگے۔ یہ خودکشی ہے۔ ان کے علاوہ یہ وجہ بھی ہے کہ بے صرفی خیانت و غصب ہے اور اتلاف جمعیت کا ایک سبب ہے ——— کم صرفی بے صرفی ہی کی ایک شق ہے اسلئے وہ بھی حرام الا کہ ضرورتاً اور ایثاراً ہو ——— بے صرفی کی طرح غلط صرفی بھی حرام جیسا کہ غلط کسبی حرام۔ غلط صرفی کیا ہے؟ دین کے ضابطۂ تصرف کے خلاف جو صرف ہو۔ مثلاً تعیش پر صرف، آرائش پر صرف، تکلف پر صرف، نمائش پر صرف، رشوت پر صرف، خوشامد پر صرف، محرمات میں صرف، مکروہات میں صرف۔ زیادہ صرفی بھی غلط صرفی ہی ایک شاخ ہے۔ آمدنی سے زیادہ صرف، زائد صرفی ہے۔ غلط صرف کو نفسانی صرف بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۲) صرف کو حتی الوسع انتظاماً بھی اجتماعی بناؤ جیسا کہ حقیقتاً اجتماعی ہو۔ اگر نظام اجتماعی قائم ہے۔ جماعت ربانی دینی کا یا پوری جمعیت انسانی کا۔ اگر نہیں قائم ہے تو مجبوراً صرف حقیقتاً اجتماعی رکھو مگر ساتھ ہی ساتھ کوشش کرتے رہو کہ کم سے کم جماعت ربانی دینی اجتماعی نظام قائم ہوجائے اور جب ایسا ہوجائے تب انتظام بھی کرلو ——— اجتماعیت صرف کی یہ ہے کہ اپنی پوری بچت اپنی فرداً نفی زندگی کے مصارف کو خود رکھ کر جماعت یا جمعیت عالمہ یا ربانی حکومت کے نظامیہ یا خیر کے حوالے کردو جس کو وہ

اپنے اختیار سے اپنے ربّانی ضابطۂ صرف کے مطابق صرف کریں ۔۔۔
ربّانی حکومت کا اصلی مستقل محصول آمدنی یہی ہے ۔ زکوٰۃ جس پر صلوٰۃ
کی اقامت منحصر ہے یہی ہے ۔ جس کا بنیادی اقلّی حصّہ چالیسواں ہو سکتا
ہے ۔ جو ہر حال میں قانوناً واجب ہے ۔ جو مبتدیین دین کو مدِّ نظر رکھ
کر مشخص کیا گیا ہے ۔ لیکن جس کا توسطی اوسطی حصّہ وہی ہے جو بتایا گیا
ہے ۔ جس کو صدقہ بمعنی عفو (بچت) کے غیر معیّن مقدار سے تعبیر کیا گیا
ہے ۔ جو ہر حال میں قانوناً واجب نہیں ہے ۔ مگر ہر حال میں مستحسن
اور متوقع یقیناً ہے ۔۔ جس کی ہی ادائیگی سے متوسطی دینداری نصیب
ہو سکتی ہے ۔ ورنہ صرف ابتدائی دینداری ہاتھ آ سکتی ہے ۔
جس کا تکمیلی انتہائی حصّہ جو صرف شدید قسم کے مخصوص ترینا وقتوں
اور حالتوں میں عائد کیا جاتا ہے جس کی حد یہ ہے کہ مہلک بھوک اور
برہنگی تک کو اختیار کر لو ۔ بے خانمانی و ویرانی تک کو قبول کر لو ۔ حتّیٰ کہ
اندیشۂ اتلاف تک کو گوارا کر لو ۔ لیکن جو کچھ تمہارے پاس ہے ، وہ
سب نذر کر دو ، اور مسرت و بشاشت سے نذر کر دو ۔ جس کا نام ایثار
رکھا گیا ہے ۔

یہ یاد رکھو کہ اگر جمعیت یا جماعت ربّانی یا حکومت ربّانی موجود ہے
تو زکوٰۃ کی انفرادی ادائیگی حساب سے باہر اور اعتبار سے خارج ہے ۔
سب کچھ خود دے دینے کے بعد بھی زکوٰۃ بدستور عائد رہے گی ۔ مع ایسے
مواخذے کے جس کو جمعیت و جماعت یا حکومت وصول مکرّر کرنے کا حق رکھتی
ہے جس کو ادا کیے بغیر نہ گردن آزاد ہو سکتی ہے نہ روح نہ حساب پاک
ہو سکتا ہے نہ محاسبہ ۔

البتہ اگر جمعیت ربّانیہ جماعت ربّانی دینی یا حکومت ربّانی نہیں قائم ہے تو
جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے انفرادی ادائیگی ہی معتبر ہو جائے گی ۔

بشرطیکہ انہیں مصارف میں صرف کرو جو مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھو کہ زکوٰۃ یا صدقہ حکومتِ نفسانی یا حاکمۃ جمعیت نفسانیہ کو حوالے کرنا جائز نہیں ہے۔ اوّل اس لئے کہ وہ انہیں ربانی مصارف میں صرف ہی نہیں کر سکے گی۔ اس کی نفسانیت اس کو ایسا کرنے سے روکے گی۔ لیکن اگر ایسا کر بھی سکے تب بھی حوالگی اس لئے ناجائز ہے کہ حوالگی حکومتِ نفسانی یا جمعیتہ حاکمہ نفسانیہ کو تسلیم کرنے کا نشان بن جائے گی۔ اور اس سے ربانیت کی بنیاد ہی اکھڑ جائے گی۔ پھر یہ کہ آئینِ دین کی ایک بنیادی دفعہ حکومت نفسانی اور جمعیتہ حاکمۃ نفسانیۃ کو جڑ سے اکھیڑ دینا ہے۔ یہ بنیادی دفعہ تسلیم کی وجہ سے خود جڑ سے اکھڑ جائے گی۔

یہ بھی یاد رکھو کہ حکومتِ نفسانی یا جمعیتہ حاکمۃ نفسانیہ کو جو محاصل ادا کرتے ہو وہ زکوٰۃ و صدقے کا کفارہ نہیں بن سکتے۔ اور اس لئے محاصل کے ذریعہ زکوٰۃ و صدقہ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

دینِ ربانی کے ربانی آئین میں ان محاصل کی حیثیت صرف تاوان کی ہے۔ یعنے تاوان غلامی کی۔ اور تاوان تاوان ہے نہ کہ کفارہ۔ پس جب تک حکومت نفسانی کی غلامی کا جرم قائم رکھوگے۔ یہ تاوان عائد رہے گا اور اس تاوان کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و صدقہ بھی عائد رہے گا۔

اگر ان دو دو محصولوں کی ادائیگی تمہاری کمر کو دُہری اور تمہاری پیٹھ کو جھکی جھکی بنا دیتی ہے تو مضائقہ نہیں۔ اس کا گلہ کیوں کرو۔ یہ تو تمہاری ہی بداعمالی کا پھل ہے۔ اگر تمہیں اس تکلیف کا صحیح احساس ہے۔ تو اس کا یہ علاج تو ہو نہیں سکتا کہ دین کو ٹھکا دیا جائے۔ دین کا سرکاری محصول (زکوٰۃ و صدقہ) بند کر دو۔ دین سے بغاوت کر لو۔

یہ علاج علاج نہیں ہے خودکشی ہے ۔ یہ علاج تو تمہاری روح کو ہلاک کر ڈالے گا تم بد
دین نفسانی شیطانی ۔ اللہ کے باغی بنجاؤ گے اور اسکی سزا آخرت میں طولانی جہنم عذابی
اور دنیا میں قتل عقابی سے پاؤ گے ۔ اگر دین کی حکومت ربانی دُنیا کے کسی گوشہ میں بھی قائم ہے
تو اسکو حق ہوگا کہ کسی تدبیر سے تمہیں قتل کرادے ۔ کیونکہ تم دین کے باغی ہو ۔ اور وہ دین
کی عاملانہ نمائندہ ہے اور اگر کہیں بھی وہ نہیں قائم ہے تو انفرادی طور پر ہر دین دار کو حق
ہوگا کہ وہ تنہا ہی تمہیں موت کے گھاٹ اُتار دے کیونکہ تم دین کے باغی ہو اور وہ دین کا
نمائندہ ہے شخصی کارندہ بھی ۔ اگرچہ یہ حق صرف اس دین دار کو ہوگا کہ جو کسی حکومت
نفسانی کو اس کا محصول ادا نہ کرتا ہو ۔ اسلئے کہ جو ایسا کرتا ہے وہ اگرچہ دین کا محصول
بھی ادا کرتا ہو خود بھی دین کا ادھا باغی ہے ۔ تب تمہاری اس مصیبت کا ایک ہی علاج ہے
وہ یہ کہ حکومت نفسانی سے رہائی کی جد وجہد خلوص سے استقامت سے مداومت کے ساتھ
اور جب تک یہ جد وجہد کامیاب نہیں ہوتی تب تک دہری محاصل کا دہرا بوجھ اُٹھاتے
رہو مگر اس ڈھنگ سے کہ دینی محصول کو بشاشت اور بشاشت کے ساتھ ادا کرو اور کفری
محصول کو کراہت اور ملامت کی علامت کے ساتھ جیب سے نکالو ۔ اور کیا اچھا ہو اگر
حکومت نفسانی سے گلوخلاصی کی کاروائی عدم ادائیگی محصول ہی سے شروع کرو ۔۔۔ اس
اندیشہ کی بھی اس مہم میں پروانہ کرو کہ شاید اس عمل میں تمہارے پاؤں استقامت سے
ڈگمگا جائیں ۔ مہم کو بے اندیشہ جاری کردو ۔ اور اگر اثنا مہم میں ڈگمگاہٹ آتی ہے تو
آنے دو ، ڈگمگاہٹ صرف تمہارا وقار کھوئے گی مہم کا وقار تو قائم ہی رہے گا ۔ مہم کے گرتے
ہوئے جھنڈے کو ممکن ہے دوسرے بہادر سنبھال لیں اور ضرور ایسا ہوگا ۔ انقلابی مہم کا خاصہ
ہے کہ اسکے کچھ بزدل سپاہی اگر اسکو چھوڑ کر بھاگ ہی آتے ہیں تو دوسرے بہادر سپاہی اس کو
سنبھالنے کے لئے ضرور میدان میں آن ڈٹتے ہیں ۔ پس مہم کی حرمت و عظمت کی حفاظت
کی طرف سے بالکل مطمئن رہ کر اسکو چھیڑ دو ۔ پھر مہم کی ابتدائی ناکامیوں کے ڈر کو بھی دل سے
نکال پھینکو ۔ انقلابی مہموں کا تو خاصہ ہی ہے کہ وہ شروع شروع میں ناکام ہوتی رہتی ہیں
لیکن ان کی ناکامیوں ہی میں ان کی کامیابی کا سواد پختہ ہوتا رہتا ہے اور اسکی بدولت

وہ آخر آخر میں کسی موزوں وقت پر کامیاب ہو گئی ہیں — پھر ناکامی و کامیابی کا سوچ بچار تمہاری حدود اختیار کی چیز کب ہے۔ تب اس فضول جنجال میں اپنے کو کیوں پھنساؤ تمہیں تو صرف اپنا فرض ادا کرنا ہے نتیجہ مالک کے سپرد ہے۔ نتیجے کی فکر اس کو کرنا چاہئے اور وہ ضرور کرے گا۔ لسکے دستور و نظام میں نتیجہ بھی ایک ہی قسم کا نکلتا ہے — کامیابی۔

(۳) مصارف صرفیات میں چوتھی چیز اطعام المساکین ہے جس کا سادہ مطلب تو کھلا ہوا ہے محتاجوں کو کھانا کھلانا۔ لیکن اسکی ربانی حقیقت جو اسکی گہرائی میں پہونچنے سے کھلتی ہے یہ ہے کہ محتاجوں کو اسطرح مت کھلاؤ کہ ان کی محتاجی بنی رہے بلکہ اسطرح کھلاؤ کہ محتاجی مٹ رہے۔ محتاج کو وقتی طور پر آسودہ کر دینا اور اسکی محتاجی کو باقی رکھنا۔ محتاج کی خدمت نہیں ہے۔ محتاج کی بے خدمتی ہے۔ محتاج پر رحم نہیں۔ محتاج پر ظلم ہے محتاج کے ساتھ دوستی نہیں۔ محتاج کے ساتھ دشمنی ہے۔ محتاج کی حق ادائیگی نہیں ہے محتاج کی حق بربادی ہے۔ ایسا کرنا محتاج کی ذلت و کلفت کو مستند اور مستقل بنانا ہے۔ — محتاج کی محتاجی مٹا دینے کا ضابطہ ربانی ایک جگہ بنا دیا گیا ہے۔ لیکن ذرا مزید توضیح کے ساتھ پھر دہرا دیا جاتا ہے۔ محتاج کو پہلے جانچو کہ محتاج ہے یا نہیں۔ اگر محتاج نہ ٹھہرے تو اسکو محتاج منشی سے توبہ کن بناؤ۔ اصرار پر اسکی تعزیر کا انتظام کرو۔ محکمہ احتساب و تعزیر کے ذریعے تعزیر کے بعد اسکو کام میں لگاؤ۔ اگر محتاج ٹھہرے تو پھر پتہ لگاؤ کہ محتاجی بیکاری کے سبب ہے یا ناکارگی کے سبب سے۔ بیکاری کے سبب ہے تو اس کے لیے کار کا انتظام کرو۔ اگر کار کا انتظام نہ ہو سکے تو حکومت نفسانی پر جس کی بدولت یہ بدنظمی ہے۔ نعمت سمجھتے ہوئے اور خود اپنے پر بھی نعمت سمجھتے ہوئے کہ تم حکومت نفسانی کو اوڑھے بچھائے پھرتے ہو۔ اسکو اپنی آمدنی کا ایک مستقل حصہ دار بناؤ اور مستقل حصہ دار کی حیثیت سے اس کا بار خرچ اپنے ذمے لو اسوقت تک جب تک اسکے لئے کار کا انتظام نہ ہو سکے اور ساتھ ساتھ تلاش کار میں برابر لگے رہو۔ اگر ناکارگی سبب ہے محتاجی کا تو پھر اسے بلا معاوضہ مستقل شریک حیات بنا لو۔ اور محتاج کی حیثیت سے نہیں حصہ دار کی حیثیت سے بناؤ — پھر ثواب کی نیت سے ایسا مت کرو۔ ثواب کی نیت سے کرنا گناہ خریدنا

ہے۔ ثواب کی نیت سے ایسا کرنا طعام المساکین کی فرضیت سے انکار کرنا ہے اور اسکو فرضیت سے نکال کر نفل میں پہونچا دینا ہے جیسا کہ نماز کی فرضیت سے انکار کرنا اور اسکو نفل بنا دینا گناہ ہے۔ ایسا ہی ہر فرض نیکی کو فرض سے نکال کر نفل بنا دینا گنا ہے۔ ثواب کے بجائے فرض کی نیت سے ایسا کرو۔ فرض بھی وہ نہیں جو رحم پر مبنی ہے۔ بلکہ وہ فرض جو حق پر مبنی ہے۔ محتاج کو کھلانا یا فراغت یافتہ بنانا رحم نہیں ہے۔ حق ہے۔ اطعام المساکین میں اطعام کا مقصد خاص کھلانا ہی نہیں ہے۔ بلکہ فارغ بنانا ہے، ہر قسم کی حاجت سے جز سے کل مراد لیا گیا ہے جز کا نام کل کو دیا گیا ہے۔ یہ نقشہ ہے ربّانی معاشیت کا۔ اس کے خلاف جو بھی معاشی نقشہ ہے وہ نفسانی نقشہ ہے معاشیت کا جس سے پرہیز واجب ہے۔

معاشریات

معاشرتی حقائقیات | ربّانی معاشرت کے ربّانی عناصر اربعہ ربّانی معاشیت ربّانی معاملت، ربّانی سیاست، ربّانی روحانیت ہیں۔ یہ چاروں جمع ہوں تو ربّانی معاشرت پیدا ہوتی ہے ان میں سے ایک بھی غائب ہو تو معاشرت نفسانی ہو جاتی ہے ربّانی نہیں رہ جاتی —— معاشرت کو بھی معشیت کی طرح ربّانی بناؤ۔ نفسانی معاشرت سے بھی بچو۔ جیسا کہ نفسانی معشیت سے بچو۔ اور اتنا ہی بچو۔ جتنا خطرات اور مہلکات سے بچتے ہو۔ نفسانی معاشرت شیطانی معاشرت، رہبانی معاشرت، ہیولانی معاشرت کی تین قسموں میں بٹی ہوئی ہے شیطانی معاشرت وہ ہے جو حرام حلال پاک وناپاک۔ مکروہ مستحب کی تمیز سے خالی ہوتی ہے۔ جو نفس پروری اور عیش پرستی سکھاتی ہے جو زندگی کو عظم مسر شیطانی بنا دیتی ہے۔ جو انسانیت کے لئے شرم کا داغ اور وبال کا سامان ہوتی ہے۔ شیطانی معاشرت کا بنیادی نظریہ ملوکیت ہے۔ رہبانی معاشرت وہ ہے جو حرام ناپاک، مکروہ تو نہیں ہوتی۔ مگر مہلک اتنی ہی ہوتی ہے، جتنی شیطانی معاشرت ہوتی ہے وہ زندگی کو موت بنا دیتی ہے۔ اسکا سایہ موت آفریں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو ہلاک کرنے اور دنیا کو اُجاڑ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے اور اس طرح مشیت الٰہی سے آمادہ جنگ رہتی ہے۔

لطف یہ کہ محبت الٰہی کے نام سے جنگ پہ مشیت الٰہی کرتی رہتی ہے۔ رہبانی معاشرت کا
بنیادی نظریہ ہلوکیت ہے۔۔ ہیولانی معاشرت بے اصول و بے مقصد معاشرت کا نام
ہے۔ ہیولانی معاشرت بھی مہلک ہے۔ ہیولانی معاشرت کا بنیادی نظریہ ہیولیت
ہے ــــ ربانی معاشرت وہ ہے جو زندگی کو پالتی ہے۔ بڑھاتی ہے۔ اُچھالتی ہے۔ معراج
پر پہونچا دیتی ہے جو معاشرت الٰہی کا ٹھیک ٹھیک نمونہ ہوتی ہے۔ جو مقبول۔ محبوب محمود
ہوتی ہے۔ اِس کا بنیادی نظریہ ربوبیت ہے ــــ ربانی معاشرت دُنیا اور آخرت
مادیت اور روحانیت دونوں کو لپیٹے اور سمیٹے ہوتی ہے۔ اِس توازن و تعاون کے
ساتھ کہ زندگی کی ترازو میں اِن دونوں پلڑوں میں سے ایک بھی جھکا ہوا نہیں دیکھا جا
سکتا۔ جتنی دُنیا اُتنی ہی آخرت۔ جتنی آخرت اُتنی ہی دُنیا۔ پھر دونوں کی شان برابر
ہی برابر نہیں ہوتی۔ اعلےٰ سے اعلےٰ بھی ہوتی ہے۔ توازن ہی نہیں ہوتا ہے تعلّی اور تکمیل
بھی ہوتی ہے۔ اسکی آخرت روحانیت جنت ہی نہیں قربت اور اعلیٰ ترین قربت
تک بھی حاصل ہوتی ہے اور اسکی دُنیا مادیت اور فراغت ہی نہیں۔ قدرت۔ اور
حکومت کی بھی مالک ہوتی ہے۔

احوالیات (۱) ربانی معاشرت کے جزئیاتی قواعد و ضوابط و آداب و اطوار
دینِ ربانی کے جزئیاتی ربانی ضابطہ معاشرت سے معلوم کرو۔
کلیاتی اُصول و آداب یہاں بھی بتا دیئے جاتے ہیں

(۲) ربانی معاشرت کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ معیشت یعنے کمانا اور خرچ کرنا۔
ربانی ہو۔ حلال پاک فائدہ کش۔ فائدہ رساں کمائی ہو۔ اور حلال پاک۔ فائدہ کش
فائدہ رساں خرچ ہو۔ حرام ناپاک نقصان رساں چیزوں سے کمائی نہ ہو۔ حرام ناپاک
نقصان رساں مصرفوں میں خرچ نہ ہو اور حرام ناپاک نقصان رساں طریقوں سے
خرچ نہ ہو ــــ ربانی معاشرت کی دوسری ضرورت یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ
معاملت ربانی ہو یعنی ایسی اور ایسے طریق پر معاملت ہو کہ مخلوق کو نقصان نہ پہونچے
مخلوق تنزل کا شکار نہ ہو جائے اور ترقی پذیر ہو سکے ــــ نہ مادی نقصان نہ روحانی

نقصان، مادی فائدہ بھی اور روحانی فائدہ بھی، نہ مادی تنزل، نہ روحانی تنزل، مادی ترقی بھی اور روحانی ترقی بھی ـــــ تیسری ضرورت یہ ہے کہ سیاست بھی ربانی ہو، یعنی نقصان رساں نہ ہو اور فائدہ رساں ہو۔ تنزل بخش نہ ہو اور ترقی بخش ہو تاکہ مخلوق نقصان اور تنزل سے بچتی ہوئی فائدہ اور ترقی اٹھاتی اور کرتی ہوئی بڑھتی چلے ـــ چوتھی ضرورت یہ ہے کہ روحانیت بھی ربانی ہو۔ رہبانی نہ ہو۔ یعنی وہ روحانیت نہ ہو جو دنیا چھڑا دیتی ہے اور دنیا میں محکوم و ذلیل، عاجز و پست، مفلس و جاہل بے مطلب، نامراد، بے کارہ و ناکارہ بنا چھوڑتی ہے۔ وہ روحانیت ہو جو دنیا کو جھکا دیتی ہے اور دنیا میں حاکم و مقتدر بنا دیتی ہے۔ باکار و کارکن رکھتی ہے۔ با مطلب و بامراد بناتی ہے ـــ ربانی معاشرت ربانی جمعیت، ربانی جماعت، ربانی تہذیب، ربانی حکومت، ربانی دین پر بھی موقوف و منحصر ہے۔ پس ان پنجگانہ ربانی اسباب معاشرت کو بھی مہیا کرنا چاہیئے ـــ ربانی معاشرت کے یہ سات ربانی لوازم بھی ہیں۔

(۱)۔ ربانی تصورات (۲) ربانی صفات (۳) ربانی جذبات (۴) ربانی اخلاق (۵) ربانی اعمال (۶) ربانی عبادات (۷) ربانی روحانیات ـــ ان ہفتگانہ لوازم معاشرت ربانی کو بھی پیدا کرنا چاہیئے ـــ ربانی معاشرت کا مجموعی مقصد و نتیجہ ربوبیت ہے۔ ربوبیت ہی ربانی معاشرت کا اصلی اور اعلیٰ معیار ہے۔ اسی پر معاشرت پرکھی جائے گی اور جو اس پر اترے گی اس کو ربانی معاشرت کی سند دی جائے گی۔ جو نہیں اترے گی اس کو نفسانی معاشرت کا ٹیکہ لگا دیا جائے گا ـــ ربوبیت کا عملی تکمیلی نقشہ یہ ہے کہ ایک شخص بھی محتاج، پست، ذلیل نہ رہ جائے۔ ظلم اور فسق کا نام و نشان نہ رہ جائے۔ ترقی و تکمیل کی سرگرمیاں عام بن جائیں ـ جو معاشرت اس نقشہ زندگی کو مدد دیتی ہے۔ وہ ربانی معاشرت ہے جو نہیں مدد دیتی وہ نفسانی معاشرت ہے خواہ حیوانی قسم کی ہو خواہ شیطانی قسم کی خواہ رہبانی قسم کی ـــ ربانی معاشرت انفرادی، اور اجتماعی، دونوں حیثیتیں رکھتی ہے۔ اور اس لئے دونوں حیثیتوں میں اس کو جھلکنا چاہیئے۔ شخصی، معاشرت بھی ربانی ہونی چاہیئے۔ اجتماعی معاشرت بھی ربانی ہونی چاہیئے۔ دونوں

آپس میں بڑی حد تک متعاون بھی ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے ضروری اور ایک دوسرے کا مددگار ہے۔ جماعتی معاشرت ربّانی نہ ہو تو شخصی معاشرت کا ربّانی ہونا مشکل ہو جاتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا شرابیوں میں رہ کر اور شراب خانوں میں بیٹھ کر شرابی نہ ہونا۔ یا بدکاروں میں بیٹھ کر بدکار نہ بننا۔ تب شخصی معاشرتوں کو ربانی بننے کے لئے ضروری ہے کہ جماعتی معاشرت بھی ربّانی ہو۔ لیکن یہ بات صرف مشکل ہے ناممکن نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے گو کمتر ہی ہو سکتا ہے کہ جماعتی معاشرت کے نفسانی ہوتے ہوئے بھی کچھ شخصی معاشرتیں ربّانی رہیں۔ ایسے اشخاص جو نفسانی جماعتی معاشرت میں اپنی شخصی معاشرتیں ربانی بنا لے جائیں۔ خاردار جھاڑیوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی مانند ہیں۔ یہ لوگ پرستش نہ بھی خدائیت کے ضرور قابل ہوتے ہیں۔ یہ انبیا ہوتے ہیں یا اولیاء یا مثلین انبیاء اور مثلین اولیاء۔ یہی وہ ہوتے ہیں جو بسا اوقات جماعتی معاشرت میں بھی انقلاب پیدا کر دیتے ہیں اور اس کو نفسانیت سے ربّانیت کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ اسی طرح جماعتی معاشرت کی ربّانیت شخصی معاشرتوں کی ربّانیت کے بغیر مشکل ہے اگرچہ ناممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ اس حالت میں ممکن ہے جب کہ حکومت ربّانی تہذیب ربّانی ہو۔

اخلاقیات

حقیقت اخلاق | اخلاق اعمالیات ہی کی شاخ ہیں۔ اخلاق اعمال ہی ہیں مگر نفسیاتی اعمال جو صفات کا رنگ رکھتے ہیں۔ اور غیر محسوس ہیں البتہ نتائج کی رو سے محسوس ہیں جو جوارحی اعمال کو اپنے خاص رنگ میں رنگ دیتے ہیں جو انسانی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جو انسانی حیات کو ایک خاص انداز بخش دیتے ہیں۔ انسانی سیرت کے لئے تصورات اور جذبات کے بعد اخلاق بھی عاملانہ اور حاکمانہ شان رکھتے ہیں۔

اصولیات | (۱)۔ اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ربّانی اخلاق۔ اور نفسانی اخلاق،

ربانی اخلاق وہ ہیں جو اخلاق الٰہی کے نمونے ہوتے ہیں اور انہیں کے پرتو ہیں۔ جو ربوبیت
کو اپنا شعار و دثار بنا لیتے ہیں جن سے ربوبیت ہی ابھرتی ہے اور پرورش پاتی ہے۔
نفسانی اخلاق وہ ہیں جو اخلاق الٰہی کی ضد ہوتے ہیں جن کی سمت رجحان نفس پروری
ہوتی ہے جن سے ملوکیت کو غذا ملتی ہے۔ جن کا نتیجہ ملوکیت ہی ہو سکتی ہے یعنی اپنی
تعمیر دوسروں کی تخریب ــــ نفسانی اخلاق، سہولانی اخلاق، شیطانی اخلاق، ربانی
اخلاق کی تین قسموں میں بٹے ہوتے ہیں۔ سہولانی اخلاق وہ ہیں جن کی نہ کوئی منزل و مقصود
غرض۔ نہ خود معین نہ مضبوط۔ شیطانی اخلاق جو کچھ بھی ملا ہو ہے۔ ربانی اخلاق وہ ہیں جو تباہی
کی طرف لے جاتے ہیں اور ربوبیت سے بھاگتے ہیں۔ ان میں ایسا وہ ہے جو ربوبیت کو دبا
دیتے ہوں نقصان نہ پہنچاتے ہوں ــــ ربانی اخلاق کلیاتی دس ہیں یہ
اخلاق عشرہ ہیں۔ محبت، خدمت، صداقت، عدالت، لطافت، عزیمت، ہمت، استقامت،
فعالیت، علویت ــــ یہ کلیاتی اخلاق ربانی، اسی جزئیات بھی رکھتے ہیں۔ جو جزئیاتی
اخلاق ربانی کہلا سکتے ہیں۔

محبت کی جزئیات ۔۔ رحمت، مروت، شفقت، انسیت۔
صداقت کی جزئیات۔ اصولیت، اصلیت، [illegible]، [illegible]۔
عدالت کی جزئیات۔ مساواتیت، مواخاتیت، اشتراکیت۔
خدمت کی جزئیات۔ ایثاریت، احسانیت، امدادیت۔
لطافت کی جزئیات۔ طہارت، نظافت، نفاست، انکساریت، انصافیت،
بشاشت، حلاوت۔
عزیمت کی جزئیات۔ فکریت، متانت، [illegible]، توکلیت۔
ہمت کی جزئیات۔ اقدامیت، مقابلیت، شجاعت۔
استقامت کی جزئیات۔ مداومت، استمراریت، [illegible]۔
فعالیت کی جزئیات۔ سالکیت، استغراقیت، [illegible]۔
علویت کی جزئیات۔ ارتقائیت، اکملیت۔

پھر ان شاخوں کی بھی شاخیں ہیں ——— اخلاق ربانی کو بھی وہی اہمیت دو اور اسی شدومد سے انہیں پیدا کرنے اور راسخ کرنے کی کوشش کرو جو اہمیت ربانی تصورات اور ربانی جذبات کو حاصل ہے اور جس اہتمام و ابرام سے انہیں پیدا کرنا ضروری ہے۔ تب تمہاری حیات ربانی حیات اور تمہاری سیرت ربانی سیرت بننے کی استعداد پیدا کرے گی ورنہ نفسانیت گردن کا طوق بنکر رہے گی اور تم نفسانی کے سوا کچھ نہ بن سکو گے۔

روحانیات

حقائق روحانیاتی | یہاں روحانیات سے مراد روحانی اعمال ہیں، جو اخلاقی اعمال سے بھی زیادہ غیر محسوس ہیں جو اخلاقی اعمال کے بواطن ہیں؛ اور اخلاقی اعمال ان کے ظواہر ہیں۔ اخلاق تو قالب ہیں وہ ارواح ہیں۔ اخلاق انسانی حیات اور انسانی سیرت کی عمارت کے لئے اینٹ، پتھر، لوہا، لکڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن سے یہ عمارت صرف بنتی ہے۔ روحانیات اس عمارت کے لئے پالش رنگ اور گلکاری کا حکم رکھتے ہیں جن سے یہ عمارت رچتی ہے۔ اخلاق عمارت سیرت کا صرف ڈھانچہ کھڑا کر دیتے ہیں روح نہیں ڈالتے۔ روحانیات اس کو روح بخشتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ربانی الاخلاق ہو۔ ربانی الروحانیات نہ ہو۔ ایسا شخص ربانی ضرور کہلائے گا اور ہو گا بھی مگر بے روح ربانی ہو گا۔ ظاہری پہلو سے ربانی باطنی پہلو سے غیر ربانی اور نفسانی۔ پس جب تک روحانیات بھی ربانی نہ ہوں محض اخلاق کی ربانیت سے ایک شخص حقیقی ربانی نہیں بن سکتا تب یہ ضروری ہے کہ اخلاق کے ساتھ ساتھ روحانیات کو بھی ربانی بناؤ تاکہ حقیقی ربانی بن سکو۔

احوالیات | روحانیات بھی نفسانی اور ربانی دو طرح کے ہیں ——— روحانیات روح کے روابط و میلانات کا نام ہے۔ روحی روابط نفس سے بھی متعلق ہو سکتے ہیں اور رب سے۔ نفس سے متعلق ہونے والے روابط نفسانی روابط ہیں اور نفسانی روحانیات ہیں۔ رب سے تعلق رکھنے والے روابط ربانی روابط ہیں اور ربانی روحانیات ہیں ——— ربانی روایات ہی ہیں جو ربانی

اخلاق کے کھلونے کو تمکین بناتے ہیں اور ربانی اخلاق کے بے روح قالب کو روح بخش کر ذی روح کر دیتے ہیں ـــــ ربانی روحانیات نہ ہوں تو انسانیت محض حیوانیت بن سکتی ہے۔ مگر انسانیت نہیں بن سکتی۔ انسانیت الٰہیت ہے صرف پالش زدہ حیوانیت نہیں ہے بلکہ الٰہیت کا پرتو ہے۔ ظاہری الٰہیت کا بھی پرتو اور باطنی الٰہیت کا بھی پرتو [illegible] الٰہیت کا جامع و کامل پرتو۔ یہ الٰہیت کیلئے بیچارے ربانی اخلاق کے [illegible] الٰہیت محض نقالی کی چیز نہیں ہے رشتہ داری کی بھی چیز ہے۔ [illegible] ربانی روابط یا ربانی روحانیات الٰہیت سے انسانیت کی روحی رشتہ داری قائم [illegible] انسانیت الٰہیت کو اپنے اندر کیسے جذب کر سکے گی اور خود الٰہیت کیسے بن سکے گی۔ جیسے انسان کی تصویر انسان نہیں بن سکتی۔ کیونکہ انسان کی تصویر انسان کی صرف نقالی رکھتی ہے، رشتہ داری نہیں رکھتی ـــــ تب صرف اخلاق پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جاؤ۔ روحانیات کو بھی پیدا کرو۔ اور جس طرح اخلاق کو ربانی بنایا ہے روحانیات کو بھی ربانی بنا ڈالو ـــــ ہاں مگر ایک بات یاد رہے۔ روحانیات و روابط متوازن بھی ہو سکتے ہیں، غیر متوازن بھی۔ اگر غیر متوازن ہو گئے تو رہبانیت دبے پاؤں گھس آئے گی اور ربانیت کو نکال باہر کرے گی۔ ربانیت توازن کا نام ہے۔ مادیت اور روحانیت، ظاہریت اور باطنیت، نفسیت اور ربیت کے درمیان توازن کا نام ـــ جہاں توازن ہٹا، ربانیت رخصت ہوئی ـ ظاہر غالب ہوا تو شیطانیت تشریف فرما ہو گئی۔ باطن غالب ہوا تو رہبانیت جلوہ افزا ہو گئی۔ ربانیت غریب تو توازن کے دم تک ہے ـــــ تب عشق عشق رہے جنون نہ بن جائے۔ خودی خدائی سے منسلک رہے مگر بے خودی نہ ہو جائے۔

(۲)۔ روحانیات، روابط کا نام ہے۔ روابط، جذبات ہیں۔ جذبات لفظوں میں مکمل منعکس نہیں ہو سکتے تاہم ادھوری تعبیر کی حیثیت سے بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ ربانی روحانیات یا ربانی روابط بالرب۔ ذیل کے چند اصطلاحات سے ناقص حد تک ادا کئے جاتے ہیں۔ رجوع، خشوع سلوک، عرفان، قرب، حضور، وصول، طیر، سیر، فنا، بقا ـــ تفصیلی علم کے لئے علم الروحانیات جس کو علم التصوف بھی کہا جاتا ہے پڑھنا چاہئے ـــ پس اخلاق کے ساتھ ساتھ روحانیات پر بھی جھکے رہو ورنہ بے روح انسان بن کر رہ جاؤ گے۔ البتہ روحانیات کے زعم میں اخلاق کو [illegible] نہ کرو۔

وہیں یہ بھی چاہتی ہے کہ ایک دوسرے کے لیے فدائیت بھی کرے۔ ربوبیت اور فدائیت ربانیت کی دو برابر کی شاخیں ہیں۔ بلکہ گہری بات تو یہ ہے کہ فدائیت ربوبیت ہی کی ایک کڑی ہے اور تکملہ والی کڑی۔ فدائیت کے بغیر ربوبیت کا سلسلہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ فدائیت، ربوبیت کا قدرتی عوض ہے۔ پھر فدائیت اصل میں ہے کس کے لیے؟ ظاہر میں رب کے لیے مگر حقیقت میں خود مربوب کے لیے۔ فدائیت حقیقتاً رب کی حفاظت کے لیے نہیں ہوتی خود ربوبیت کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے اگرچہ صورتاً رب کی حفاظت بھی شریک نظر آتی ہو ــــ البتہ شرط یہ ہے کہ فدائیت رضاکارانہ ہو مجبورانہ نہ ہو۔ فدائیت مربوب کی پیشکش ہو۔ اور رضامندانہ پیش کش۔ رب کا جبری حصول نہ ہو۔ تب جب کہ قومیت شخصیت کی ربوبیت کا فرض ادا کرتی ہو شخصیت کا بھی فرض ہوگا کہ قومیت کے لیے فدائیت کا فرض بالعوض ادا کرے اور یہ سمجھتے ہوئے ادا کرے کہ یہ عوض بھی درحقیقت پھر پھرکر خود اسی کو مل جاتا ہے۔ قومیت کی حفاظت درحقیقت خزانۂ ربوبیت کی حفاظت ہے جہاں سے شخصیت کو ربوبیت کے سکے ملتے ہیں ــــ اسی پر اوپر کی منزلوں کو قیاس کرلو۔ قومیت کو بین الاقوامیت کے لیے فدائیت پیش کرنی چاہیے بین الاقوامیت کو نوعیت کے لیے فدائیت پیش کرنی چاہیے ــــ مختصر کلام یہ ہے کہ معاملت کی صورت اجتماعی ہونی چاہیے۔ مگر انفرادی اجتماعی جو جماعت کی حفاظت اور نشوونما کو مقدم رکھتی ہے مگر اس تصور اور غایت کے ساتھ کہ جماعت افراد کا تحفظ اور نشوونما کرتی رہے گی ــــ پس اپنے معاملات کو اجتماعی رنگ دو اور اتنا گہرا رنگ کہ فدائیت تک کے لیے تیار رہو تاکہ اجتماعیت بہرحال محفوظ رہے اور تم اجتماعیت کے خزانۂ ربوبیت سے اپنے لیے ربوبیت کا سامان مہیا کرتے رہو۔

(۳) ــ کلیاتِ ربانی معاملات کی بنیادی شقیں تین ہیں۔ حریت، مساوات، اخوت (آزادی۔ برابری۔ برادری)۔ ان بنیادی ربانی معاملات کو سب سے پہلے درست رکھنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ درست ہیں تو تمام فروعی معاملات ربانی بن سکیں گے ورنہ سب کے سب نفسانی ہو جائیں گے ــــ مگر یہ بھی سمجھ رکھو کہ یہ تینوں ارکان معاملت بھی

ہر صورت میں ربانی نہیں ہوتے۔ بعض صورتیں ایسی ہی ہیں جن میں وہ اپنے اضداد ہی کی مانند نفسانی ہوجاتے ہیں پس انہیں بھی ربانی رکھنے کے لئے بعض خاص صورتوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا اور بعض خاص صورتوں کو بچانا پڑے گا۔

(۴)۔ ربانی حرّیت وآزادی وہ حرّیت وآزادی ہے جو رب اور ربانیت کی قید کو نہیں توڑتی بلکہ مضبوط کرتی ہے اور خوب مضبوط کرتی ہے۔ صرف نفسانی قیدوں کو توڑتی ہے اور اس کے ساتھ نفس کے قید کو بھی توڑتی ہے مگر اس حد تک نہیں کہ نفس مٹ جائے اور ربانیت آجائے۔ صرف اس حد تک کہ نفس دب جائے۔ یہاں تک دب جائے کہ رب سے سرکشی نہ کرسکے ـــــ نفسانی حرّیت وآزادی رب اور ربانیت کی قیدوں کو بھی توڑ پھینکتی ہے اور انسان کو مطلق بے قید بناکر ہیولائے محض یا شیطان مجسم یا راہب وحشی بنا ڈالتی ہے ـــــ ربانی مساوات وبرابری وہ ہے جو ربانی برتریوں کو قائم رکھتی ہے انہیں کھینچ تان کر برابری کی صف میں نہیں گھسیٹ لانا چاہتی۔ مثلاً پیغمبروں اور ولیوں ربانی مجاہدوں اور ربانی مجتہدوں کی برتریوں کو محفوظ وملحوظ رکھتی ہے مگر ایسی محفوظیت وملحوظیت نہیں جو دوکمتروں کو کمتری میں ڈبودے بلکہ ایسی جو کمتروں کو بھی برتری کی طرف کھینچتی رہے۔ اور نفسانی کمتریوں کو بھی برابری کی صف میں نہیں کھینچ لاتی۔ مثلاً نفسانیت کے پجاریوں کو ربانیت کے باغیوں کو برابری پر نہیں لائے گی خواہ نفسانی جاہ وجلال کا انبوہ کا انبوہ ان کے گرد منڈلا رہا ہو۔ البتہ اس وقت جب وہ نفسانی کمتریوں کو چھوڑ کر برابری کے مستحق بن جائیں ـــــ نفسانی مساوات وبرابری اس فرق مراتب کی پروا نہیں کرتی۔ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکنا چاہتی ہے ـــــ ربانی اخوت وبرادری وہ ہے جو نفسانیوں کو برادری سے خارج رکھتی ہے۔ اس وقت تک جب تک وہ نفسانیت سے تائب ہوکر ربانی برادری کی رکنیت کا حق نہ پیدا کرلیں ـــ نفسانی اخوت وبرادری اس قید کو نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے شیطان اور ولی بھی بھائی بھائی ہیں اور اس لئے دونوں کی ایک ہی چٹائی ہے۔

(۵)۔ ربانی حرّیت وآزادی کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک حضرت ربی، رسول ربی اور دوجنا

ربانی کو چھوڑ کر سب کی غلامی سے آزاد ہو اور آزاد بسر کرو۔ اسی طرح دوسروں کو بھی غلامی سے آزاد رکھو اور آزاد بسر کرنے دو۔ پھر دوسروں کی غلامی سے بھی آزاد کراؤ یہاں تک کہ پوری دنیا کو غلامی سے آزاد کراؤ اور آزاد رکھو —— ربانی مساوات و برابری کا تقاضہ یہ ہے کہ پیغمبروں، ولیوں، مجاہدوں، مجتہدوں کو چھوڑ کر اور نفسانیت کے پجاریوں اور رہبانیت کے باغیوں کو نکال کر تمام انسانوں کو ایک صف میں رکھو نہ اپنے کو کمتر رکھو، نہ دوسروں کو کمتر بناؤ نہ کمتر رہنے دو —— ربانی اخوت و برادری کا تقاضہ یہ ہے کہ نفسانیت پرستوں کو چھوڑ کر سب کو بھائی بناؤ اور سب کے بھائی بن جاؤ۔ بھائی بن جانے اور بنا لینے کا یہ مطلب ہے کہ سب کے غم کو اپنا غم، سب کی ضرورت کو اپنی ضرورت، سب کی خوشی کو اپنی خوشی، سب کی ترقی و تکمیل کو اپنی ترقی و تکمیل ٹھہراؤ۔ خیالی اور زبانی نہیں اصلی اور عملی —— بے شک ان برتاؤں کے لیے جماعتی نظام اور حکومت کو بھی اسی رنگ کا ہونا لازمی ہوگا۔ لہذا جمعیت اور جماعت، نظام اور حکومت کو بھی اس رنگ کا بنانے کی کوشش کرو اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہو شخصی طور پر اپنی حد استطاعت تک اس رنگ کو نباہو۔ کل نہیں ہو سکتا تو جزو سہی مگر اس شرط پر کہ کل پیدا کرنے کی دھن میں لگے تو رہو —— کیوں حریت و آزادی یعنی ربانی حریت و آزادی ضروری چیز ہے۔ اس لیے کہ غلامی حقیقت کش اور فطرت کش چیز ہے۔ حقیقت کو مار ڈالتی ہے اور فطرت کو کھود پھینکتی ہے۔ اس کے برابر دوسرا عذاب کون ہو سکتا ہے؟ کیوں مساوات و برابری یعنی ربانی مساوات و برابری ضروری چیز ہے؟ اس لیے کہ نامساوات و نابرابری عزت کش اور ترقی سوز چیز ہے۔ عزت کو مار دیتی ہے اور ترقی کو پھونک ڈالتی ہے۔ یہ بھی چھوٹا عذاب نہیں ہے —— کیوں اخوت و برادری ضروری چیز ہے؟ اس لیے کہ بیگانگت اور غیریت، اعانت کش اور پرستش سوز چیز ہے۔ مدد کو بند کر دیتی ہے اور پوچھ گچھ کو غائب کر دیتی اور اس حالت میں بھی تکلیفوں کی ایک دنیا پنہاں ہے —— لیکن اس نکتے کو مت بھولنا کہ ان تینوں میں زندگی بخش لہروں کا ایک مشترک سرچشمہ بھی ہے اور وہی اصلی سرچشمۂ حیات ہے —— وہ ابھرتا ہے تو تہ نہریں بھی لیا

ہیں۔ وہ خشک ہے تو یہ نہریں بھی سوکھی ہوئی ملیں گی۔ یہ سرچشمہ کون ہے۔ محبت۔ پس محبت پیدا کرو۔ محبت پیدا کرو۔ محبت پیدا کرو۔ محبت ہے تو حریت و آزادی بھی ہے مساوات و برابری بھی ہے، اخوت و برادری بھی ہے۔ محبت ہے تو ربانیت بھی ہے اور ربانیت کے تمام شاخسانے اور شگوفے بھی ہیں۔ محبت نہیں ہے تو نہ ربانیت ہے نہ ربانیت کے گوشے اور شوشے ہیں۔ گویا محبت ہے تو آبادی ہے ورنہ بربادی ہے۔

سیاسیات

حقائقیات سیاسی سیاست کیا چیز ہے؟ فرائض و حقوق کا انتظام۔ سیاست اتنی جامع شاخ زندگی ہے جتنی کوئی دوسری شاخ نہیں۔ سیاست زندگی کی اتنی جامع تفسیر ہے گویا وہ کل زندگی ہے۔ سیاست معیشت اور معاشرت بھی ہے عبادت اور روحانیت بھی ہے۔ سیاست معیشت اور معاشرت کے فرائض و حقوق کا انتظام کرتی ہے اس حیثیت سے معیشت اور معاشرت ہے۔ اور احکام الٰہی کو جاری کرتی ہے اس حیثیت سے عبادت اور روحانیت ہے۔

احوالیات (۱) سیاست ربانی بھی ہوتی ہے نفسانی بھی ہوتی ہے۔ ربانی سیاست مقدس سیاست ہے اور یہی سیاست عبادت اور روحانیت بھی ہے۔ ربانی سیاست وہ ہے جو سیاست الٰہی کا نمونہ ہوتی ہے۔ الٰہی قوانین سیاسی و احکام سیاسیہ کی پابندی کرتی ہے ربوبیت اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ ربوبیت اس کی غایت و غرض ہوتی ہے ملوکیت سے اسکو نفرت ہوتی ہے۔ نفسانیت سے وہ دور بھاگتی ہے۔ سیاست نفسانی سیاست ربانی کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ ملوکیت اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ ملوکیت اس کی غرض و غایت ہوتی ہے۔ منتخب طبقے اور منتخب اشخاص کو پر عیش بنانا۔ عام خلقت کو لوٹ لوٹ کر محتاج و قلاش بنانا۔ منتخب طبقہ و اشخاص کو برتر و مفتخر بنانا اور خلقت عامہ کو کمتر اور پست تر رکھنا اس کا مطلب و مقصد ہوتا ہے۔ سیاست نفسانی اصل میں ایک با نظم و با محکم قزاقی

ہے جو بے خوف و ہراس خلقتِ عامہ کو دن دہاڑے لوٹتی رہتی ہے اور کوئی دم نہیں مار سکتا یہ ناپاک سیاست ہے اور عذابی سیاست ہے۔ اس کا چھوٹا گناہ اس سے چھوجانا گناہ۔ اس سے پرہیز واجب اس کا قلع قمع واجب، جیساکہ سیاست ربانی کا قبول واجب اختیار واجب۔

(۲)۔ سیاست ربانی کا سرچشمہ دینِ ربانی ہے اور وہ دینِ ربانی ہی کی ایک نہر اور بڑی لہر ہے — جنہوں نے کہا کہ سیاست دین سے خارج ہے اللہ ان پر رحم فرمائے اور انہیں ہدایت دے اگر ان کا یہ مطلب ہے کہ سیاست ربانی بھی خارج ہے۔ اگر سیاست مطلقاً دین سے خارج ہے پھر زندگی کے لیئے دین میں ہے کیا چیز۔ پھر دین کو ضابطۂ زندگی کہنا کیا معنی۔ زندگی دو تہائی تو صرف سیاست ہے اور دو تہائی بھی صراحتاً ورنہ ضمناً کل زندگی — تب غریب دین میں بچ کیا جاتا ہے اور غریب دین رہ کیا جاتا ہے۔

(۳)۔ سیاست ہی کا ایک آلہ اور سب سے طاقتور آلہ حکومت ہے۔ سیاست اگر ربانی ہے تو اس کے آلے کو بھی یعنی حکومت کو ربانی ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے، یہ نہیں چل سکتا کہ سیاست ربانی ہو حکومت نفسانی ہو۔ حکومت نفسانی اسی برتاؤ کی مستحق ہے جس کی مستحق سیاست نفسانی ہے یعنے اس سے بھی پرہیز ہی واجب اس کا بھی قلع قمع واجب — سیاست ربانی اور حکومت ربانی کو قبول کرو۔ سیاست نفسانی اور حکومت نفسانی کو چھوڑو اور مٹاؤ۔

تمدنیات

حقائقیاتِ تمدنی تمدن معاشرت کی اجتماعی حالت کا نام ہے۔ معاشرت جب تک انفرادی رہتی ہے، غیر متمدن رہتی ہے اور تمدن بیج کی شکل میں معاشرت میں چھپا چھپایا دبا دبایا پڑا رہتا ہے۔ جب اجتماعی بنتی ہے تو متمدن ہو جاتی ہے۔ تمدن معاشرت کی گویا ترقی یافتہ صورت ہے۔ تمدن اور سیاست توام بھائی ہیں۔ جو ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک تمدن متولد نہیں ہوتا۔ سیاست بھی رحمِ غیب سے باہر نہیں آتی۔ تمدن نکلا اور سیاست بھی نکلی۔ تمدن ہی فرائض و حقوق

ساتھ لاتا ہے، یعنے نمایاں فرائض وحقوق اور فرائض وحقوق کا انتظام ونظام ڈھونڈتا ہے پس سیاست ضروری بن جاتی ہے چونکہ فرائض وحقوق کے انتظام کا نام ہے اور پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ ضرورت خلقت کی ماں ہے — تمدن ہی ترقی وتنزل کے مدارج رکھتا ہے۔ اور معاشرت کے پھیلنے پر رہتا ہے۔ معاشرت ادنیٰ ہے تو تمدن بھی ادنیٰ ہے، معاشرت اعلیٰ ہے تو تمدن بھی اعلیٰ ہے۔

اقوالیات | تمدن معاشرت کی پہلی ترقی کے لئے تو علت اور سبب کا درجہ رکھتا ہے معاشرت کی اجتماعی صورت معاشرت کی پہلی ترقی ہے۔ پس تمدن معاشرت کی ترقی کے لئے لازمی چیز ہے اس لئے تمدن کو پیدا ہونا چاہیئے اور تمدن کو پیدا کرنا چاہیئے۔ تمدن بیشک زہر بھی ہے مگر نوشدارو بھی ہے۔ تمدن ہی گناہوں کا باپ ہے۔ سارے گناہ تمدن ہی کے نطفے سے جھڑتے ہیں۔ تمدن نہ ہو تو گناہ زمین پہ کھینے کو ترس مرے۔ لیکن تمدن ہی ترقی کا بھی باپ ہے، تمدن نہ ہو تو ترقی مادر غیب سے باہر نہ آسکے۔ گناہ زہر ہے۔ ترقی نوشدارو ہے۔ نوشدارو بہت زیادہ قیمتی چیز ہے۔ اتنی زیادہ کہ زہر کا ضرر بھی اس کی منفعت کی خاطر گوارا کیا جاسکتا ہے۔ پھر اس زہر کا زہر مار بھی ہے، تب اس زہر کی کیوں پروا کی جائے اور نوشدارو سے محروم رہا جائے۔ زہر مار کون سی چیز ہے؟ ربانیت۔ تمدن کو ربانی رنگ میں رنگ دو۔ اس کا زہر مرجائے گا۔ تمدن کو ربانی بنانے کا کیا مطلب ہے؟ اور اسکی کیا صورت ہے؟ مطلب یہ ہے کہ تمدن کا رُخ حضرت ربوبیت کی طرف ہو اور ربوبیت اسکی سجدہ گاہ ہو۔ صورت یہ ہے کہ متکلفت میں شاذجیت کو شریک کر لیا جائے اور شریک غالب بنا دیا جائے۔ یعنی سادگی تکلف پر غالب رہے۔ اور انفاق اسراف کو دبائے رہے۔ اسراف ملوکیت کی رچی ہے انفاق ربوبیت خرچی ہر ساتھ ساتھ ریاضت روحانی کو بھی مددگار بحال رکھا جائے۔ پھر حضریت میں بدویت کو بھی منضم رکھا جائے۔ کچھ کچھ وقت صحرانشینی صحرا سیری اور صحرا انظری کے بھی نذر کیا جائے جس میں صحرا کو بلدہ فرض کرکے تمام بلدی لوازم صحرا میں منتقل کردو۔ درختوں سے بولو، پہاڑوں سے کھیلو، جانوروں کو خطاب کرو۔ پرندوں کا خطاب سنو۔ صحرا اور صحرائی

مخلوقات کو ساتھ ساتھ آسمان کو اور آسمانی مخلوقات کو سمجھو سمجھاؤ۔ دیکھو دکھاؤ اور اس طریقے سے تھوڑی دیر کے لئے فطرت ساذجہ اور خلقت بدویہ بن جایا کرو۔ یوں تمدن کا زہر کون سے نکلتا رہے گا۔ اس جامع نسخے کی بدولت نہ تمدن اور تمدن کا ارتقا رکے گا نہ تمدن کا زہر گھلتا رہے گا جو روح کو بالکل ہلاک کر دے گا — پس معاشرت کو ترقی یافتہ بنانے کی غرض سے تمدن سے ہی لیتے رہو۔ اور اس کو بیش از بیش ترقی دیتے رہو اور یہی کرتے رہو کہ تمدن کو ربانی بناتے رہنے کے ذریعے تمدن کے زہر سے بھی بچتے رہو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس جامع طریق مستقیم سے ادھر ادھر بھٹکے اور ہلاک ہوئے۔ ترقی چھوڑی تو فطرت کو چھوڑا، مشیئت کو چھوڑا، حقیقت سے لڑے، قدرت سے لڑے، ربوبیت کا گلا گھونٹا، ربانیت کا خون پیا، نفسانیت سے لپٹے، رہبانیت میں پھنسے، زہر ترقی سے نہ بچے تو روح کو مار ڈالا اور جسم کو شیطان کے حوالے کر دیا۔ پس بتائے ہوئے صراط مستقیم سے نہ ہٹو۔

تہذیبات

حقائقِ تہذیب

طریق تمدن اور طریقہ معاشرت کا نام تہذیب ہے۔ تہذیب تمدن اور معاشرت کا پھل ہے۔ اور اثر ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے پہلو سے تہذیب معاشرت و تمدن کے لئے قوت محرکہ بھی ہے۔ اسی طرح تہذیب معاشرت و تمدن کی مخلوق بھی ہے۔ اور خالق بھی ہے۔ تہذیب ہی رواج کا عامیانہ نام ہے۔ رواج بھی ہے۔ رواج کو زندگی کا ایک حاکم اور زبردست ترین حاکم مانتے ہیں حتی کہ مذہب سے بھی زیادہ زبردست، اور یہ سچ بھی ہے، ایک حد تک۔ اور اب تو سولہ آنے سچ ہے۔ اب تو تہذیب ہی تہذیب ہے۔ مذہب تو غریب تھا۔ بیچارہ سہارے تہذیب کے صدقے جتنا کچھ ہے اتنا کچھ ہے اور اس کی وجہ بھی ہے۔ تہذیب تمدن کی پیداوار ہے اور تمدن مجسم ہے۔ مذہب تخیل کا پیداوار ہے اور تخیل غیر مجسم ہے۔ الہام بھی تخیل کی

پروارہ ہوتا ہے۔ گویا تہذیب حسی مذہب ہے۔ مذہب غیر حسی مذہب۔

احوالیات | تہذیب اگر ربانی ہو تو قابل قبول ورنہ قابل رد۔ تہذیب کی ربانیت یہ ہے کہ تہذیب دین سے اور دین ربانی سے مربوط رہے، اس طرح کہ اسکے ماتحت رہے۔ تہذیب جہاں دین سے آزاد ہوئی نفسانی بنی۔ پھر یہ کہ اس کا منشا ربوبیت رہے ملوکیت نہ ہو۔ پس تہذیب کو ضرور اہمیت دو مگر اس کو ربانی بنا کر رکھو نفسانی نہ بننے دو۔

عبادئیات

حقائقیات عبادتی | عبادات بھی اعمال ہی ہیں، مگر آخری اعمال اور تمام دوسرے اعمال کا نچوڑ اور عطر۔ اس لیے تمام اعمال کی درستی پر موقوف۔ عبادت عبودیت اور عبدیت یعنی بندگی اور پابندگی ہے۔ مگر رسمی صورتوں کے قالب کے ساتھ۔ مثلاً وہ رسمی صورت جو نماز میں ہے، یا وہ رسمی صورت جو حج میں ہے۔ اور مفہوم اطاعت کی شرکت کے ساتھ۔ جس سے عبادت کی ظاہری محدود صورت اپنی باطنی حیثیت میں نامحدود حقیقت بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح روحانیت کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ اور روحانیت کے ذریعہ اپنی وسعت کو سیر فی اللہ اور فنا فی اللہ کی وسعت بنا دیتی ہے۔ اس طرح عبادت تین ربانی عملوں اور حقیقتوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ عبودیت (پرستش) شریعت (اطاعت) روحانیت (تقربیت)۔ یہیں سے عبادت کی جامعیت و عالمیت اجمالی نمایاں ہے۔ عبادت کلی کی جامع تعریف ایک لفظ میں انابت (رجوع الی اللہ) ہے۔ عبودیت (بندگی) عبادت کی صرف ایک شاخ اور چھوٹی شاخ ہے لیکن اہم شاخ ہے اور جزوی عبادت ہے عبادت کی دوسری شاخ عبدیت (تمام بندگی) ہے۔ عبدیت بڑی شاخ ہے جو پوری زندگی پر چھائی ہوتی ہے۔ اور ایک شخص کی اپنی ہی اکیلی زندگی پر چھائی ہوئی نہیں ہے بلکہ

اس کے تعلق کے ساتھ کل کائنات کی زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ عبادت کلی عبودیت اور
عبدیت پھر یہ بھی ہے کہ کارندگی بغیر بندگی کے ضعیف الرابطہ ہو جاتی ہے یعنی بندگی اور
کارندگی دونوں سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ بندگی بغیر نمائندگی کے ادھوری عبادت ہے
اور زیادہ تر رسم ہی رسم ہے اور جس قدر حقیقت ہے اس قدر بھی روحی اور ذہنی حقیقت
ہے نیز شخصی حقیقت ہے۔ کارندگی بغیر نمائندگی کے بھی ادھوری عبادت ہے اور زیادہ
تر مغز ہی مغز اور روح ہی روح ہے پوست اور قالب سے جدا۔ تب نمایاں نہیں ہے
اور جسمانی دنیا کے لحاظ سے غیر محفوظ بھی ہے۔ پھر ناقص بھی ہے۔ روح جب تک قالب
سے نہیں ملتی حقیقت کا بنتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ کارندگی بغیر بندگی کے
ضعیف الرابطہ ہو جاتی ہے ــــ عبودیت اور عبدیت جب ملتی ہیں یعنی جب ایک
شخص میں بندگی اور نمائندگی دونوں جمع ہو جاتی ہیں تب خلیفۃ اللٰہیت کی شان
پیدا ہو جاتی ہے جس میں ایک پہلو ربط باللہ کا ہوتا ہے جو بندگی کا پھل ہے۔ دوسرا
پہلو امر من اللہ کا ہوتا ہے جو نمائندگی کا نتیجہ ہے۔ خلیفۃ اللٰہیت کارندگی الٰہی کا نام ہے
یعنی اللہ کی طرف سے کائنات میں مشیئت الٰہی اور ضابطۂ الٰہی کے مطابق آمرانہ و
حاکمانہ قادرانہ و مختارانہ کارفرمائی کا منصب ــــ عبادت جب تک خلیفۃ اللٰہیت
کا منصب نہ دلوا دے بے انجام یا حقیر انجام عبادت ہے یا ادنیٰ عبادت ہے وہی عبادت
اعلیٰ عبادت ہے عظیم انجام عبادت ہے جو خلیفۃ اللٰہیت کا تاج نیابت اور تخت حکومت
دلوا دے۔ ورنہ وہ ایک کوشش ہے بغیر فوز انتہائی کے اور ایک سفر ہے بغیر منزل
آخری کے ــــ پس عبادت کرو اس ربانی حوصلے کے ساتھ اور اس ربانی منصوبے
کے ساتھ کہ خلیفۃ اللٰہیت کے منصب اعلیٰ کو لے کر رہوگے۔ اس کم حوصلگی کے
ساتھ یوں عبادت کرو کہ مغفور ہو کر رہ جاؤ اور مخمور بنکر رہ جاؤ، کاسب ہو کر رہ جاؤ
اور راہب بنکر رہ جاؤ۔ یہ کم حوصلگی انسانیت اور عبادت دونوں کی توہین ہے
ــــ مطلوب و مکتوب بھی کلی عبادت ہے صرف جزئی عبادت نہیں ہے جو عبودیت
والی عبادت ہے اور رسموں کا مجموعہ ہے اور مطلوب و مکتوب اس عبدیت کی کلی عبادت

جو خلیفۃ اللّٰہیت کے منصب کا حق دار بنا دے خلیفۃ اللّٰہیت کے منصب تک پہنچا دے استعدادی فرق مراتب کے ساتھ کہ کم استعداد کو چھوٹی خلیفۃ اللّٰہیت دلوائے بیش استعداد کو بڑی خلیفۃ اللّٰہیت دلوائے۔ ناقص الاستعداد کو ناقص خلیفۃ اللّٰہیت دلوائے۔ کامل الاستعداد کو کامل خلیفۃ اللّٰہیت دلائے ـــــ عبادت کلی ہی اور اس درجے کی ہی عبادت کلی جو خلیفۃ اللّٰہیت کے منصب تک پہنچا سکے ربانی عبادت ہے جس کا انتہائی محور و مرکز توجہ ربوبیت ہے جس کا ابتدائی نتیجہ و ثمرہ خلافت الٰہی اور حکومت ربانی ہے ـــ جو اپنے شروع ہی والے نتیجے میں خلافت الٰہی اور حکومت ربانی قائم کرا دیتی ہے اور آخری نتیجے کے طور پہ ربوبیت جاری کرا دیتی ہے اور اسی کام کے لئے خلافت الٰہی اور حکومت ربانی قائم کراتی ہے ـــ اس درجے کی عبادت کلی کی سر انجامی دو شرطیں رکھتی ہے۔ ان دو شرطوں کو پوری کرو تو اس عبادت عالیۂ ربانیہ کو سر انجام کر سکو گے ورنہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ ایک شرط یہ کہ جیسے قسم کے اعمال اور عقائد ہیں اور عملیات اور ذہنیات ہیں جن کے بیانات باب بہ باب ہو چکے ہیں انہیں ربانی رنگ میں رنگ ڈالو ـــ دوسری شرط یہ کہ تفویض کلی اور تسلیم مطلق کی شان پیدا کر لو۔ یعنی یہ کہ خودی کو خدائی کے سپرد کر دو پوری سپردگی، مگر اس نیت اور عزیمت کے ساتھ نہیں کہ خودی کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دو گے اور مست ہو جاؤ گے اور سنیاسی ہو جاؤ گے بلکہ اس نیت اور عزیمت کے ساتھ کہ خودی کو رنگ خدائی میں رنگ کر بقا دلواؤ گے یعنی بقا باللہ اور امر حاصل کرو گے یعنی امر من اللہ ـــــ پس ان شرطوں کو پوری کرو پھر عبادت میں لگو۔ انشاءاللہ عبادت کلیۂ ربانیہ کا عنقا تمہارا شکار بن رہے گا۔ پھر کیا پوچھنا ہے تم ہو اور خلیفۃ اللّٰہیت کا تاج و تخت ہے تم ہو اور پوری خدائی ہے اس لئے کہ خلافتاً و نیابتاً اس پر حکومت کرو اور حکم چلاؤ، پھر اس کا تماشہ دیکھو کہ کن فیکون اور سے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اجوالیات

(۱) عبادات اصولی سات ہیں۔ طہارت۔ صلوٰۃ۔ صوم۔ حج۔ جہاد۔ خلافت۔ ربوبیت۔ طہارت۔ پاکی ہے تمام ظاہری اور باطنی ناپاکیوں اور گندگیوں سے ـــــ طہارت اپنی جامع حیثیت میں اتنی قسمیں رکھتی ہے خیالی طہارت۔ اعتقادی طہارت۔ ارادی طہارت۔ جسمانی طہارت۔ روحانی طہارت لباسی طہارت۔ معاشی طہارت۔ مکانی طہارت۔ مقامی طہارت۔ قومی طہارت۔ ملکی طہارت۔ انفرادی طہارت۔ اجتماعی طہارت۔ وقتی طہارت۔ دوامی طہارت (تفصیلات طہارت دین ربانی کے ضابطہ طہارت ربانی میں پڑھو) ـــ طہارت افتتاحی عبادت ہے یعنی وہ عبادت ہے جو اصلی عبادتوں کو شروع کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ جو دیباچہ ہے عبادتوں کا جس کے بعد ہی اصلی عبادتیں سرانجام پا سکتی ہیں ـــــ

صلوٰۃ۔ تمہیدی عبادت ہے یعنی ہے اصلی عبادت لیکن تکمیلی عبادت کے لحاظ سے تمہید کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ صرف استعداد پیدا کرتی ہے تکمیلی عبادت کی سرانجامی کے واسطے۔ باوجود اس کے صلوٰۃ چھوٹی چیز نہیں ہے بڑی چیز اور بہت بڑی چیز اتنی بڑی چیز کہ روح کو سیر عروجی میں معراج تک پہنچا دیتی ہے یعنی حضرت الوہیت سے ملا دیتی ہے ـــ پھر بھی تمہید ہے زیادہ نہیں ہے۔ معراج نہیں ہے تمہید ہے معراج صرف عروجی سیر کا منتہا ہے۔ عروجی سیر تمہیدی سیر ہے۔ مقصدی سیر تو نزولی سیر ہے یعنی وہ سیر جو سیر الی اللہ کے بعد سیر الی الخلق کی صورت اختیار کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ انسان کی تکمیل وصول الی اللہ ہے۔ نہیں عزیز۔ ہرگز نہیں۔ وصول الی اللہ تو تکمیل کی صرف تمہید ہے پھر تکمیل کیا ہے؟ وصول الی الخلق مگر وہ وصول الی الخلق جو وصول الی اللہ کے بعد نصیب ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلعم کا انتہائی کمال ان کی معراج تھی۔ نہیں، ان کا انتہائی کمال ان کی خلیفۃ اللہیت تھی ـــ بہرحال صلوٰۃ معراجی عبادت ہوتا ہے تمہیدی عبادت بھی ہے ـــ پھر کفایتی عبادت ہے۔ یعنی جو تھوڑی سی پورے کفایت مشقت مانگتی ہے۔ زیادہ ریاضت و مشقت نہیں مانگتی۔ پھر انفرادی اجتماعی عبادت ہے جو

جماعتی طور پر بھی ادا ہو سکتی ہے۔ شخصی طور پر بھی ادا ہو سکتی ہے۔ پھر مقامی عبادت
ہے یعنی جہاں ہو وہیں ادا ہو جا سکتی ہے۔ پھر ارتقائی عبادت ہے یعنی ترقی
سکھاتی ہے کیونکہ روح کو ناسوت سے لاہوت کی طرف لے جانا سکھاتی ہے۔ پھر تعلیمی
عبادت ہے یعنی تعلیم دیتی ہے اور تعلیم کی طرف کھینچتی ہے کیونکہ اُم العلم قرآن کو پیش
کرتی ہے اور قرآن سیکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ پھر تنظیم جماعت اور نظم کار سکھاتی
ہے اور اس کو سیکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ پھر تنظیمی عبادت ہے کیونکہ تنظیم پیش کرتی
ہے اور تنظیم کی ترغیب دیتی ہے۔ پھر عسکری عبادت ہے کیونکہ عسکریت کا جیتا
جاگتا نقشہ پیش کرتی ہے اور عسکریت آفرینی کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ پھر
حکومتی عبادت ہے کیونکہ حکومتی نقشہ پیش کرتی ہے اور حکومت آفرینی کی دعوت
دیتی ہے۔ اور ان تمام حیثیتوں کی جامعیت یہ صاف صاف بتاتی ہے کہ وہ اگرچہ
صراحتاً اور تماماً تکمیلی عبادت نہیں ہے۔ یہ شرف ایک دوسری عبادت کو دیا گیا ہے۔
پھر بھی ضمناً اور جزواً تکمیلی عبادت بھی ہے اس معنی میں کہ اس کو تکمیل کی جھلک
دیدی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس کو تمہیدی تکمیلی اور ابتدائی انتہائی عبادت کہنا
زیادہ صحیح ہے۔ اس تصور کے ساتھ کہ ابتدائیت اور تمہیدیت کھلی ہوئی ہے اور انتہائیت
اور تکمیلیت دبی ہوئی جیسی ہوتی ہے جو اگر کھول دی جائے اور اُبھار دی جائے
تو صلوٰۃ کو خالص تکمیلی اور کامل تکمیلی عبادت بنا چھوڑے ۔۔۔ مگر اس گرہ کو کون
کھولے اور اس کلی کو کون کھلائے صرف تین۔ خلافت الٰہی وحکومت ربانی۔ ربانی
جمعیت حاکمہ۔ کوئی قبل نبی شخصیت مدعی خلیفۃ الٰہیت ۔۔۔ بلکہ یہ سمجھ کر ادا کرو کہ وہ
انتظام خلافت وحکومت کی اور تکمیل ربوبیت در ربوبیت کی تمہیدی مشق اور مثال
ہے۔ مسجد کو دار الخلافت و دار الحکومت سمجھو ۔۔۔ نظام صلوٰۃ کو نظام خلافت وحکومت
تصور کرو۔ صلوٰۃ کو انتظام خلافت وحکومت قرار دو۔ پھر ان تینوں میں سے کسی ایک
کے صلوٰۃ وہ ہونہار بیج ہے جو مٹی کے نیچے دبا پڑا ہو ۔۔۔ نہ پھوٹے نہ پھٹے
یا وہ لعل بے بہا جو پتھر میں ملا ہوا ہے نہ چمکے نہ چمکائے۔ یا وہ آتش امین

جو بوٹے کے اندر سے پکارے اور کوئی نہ سُنے۔ یا ہاتفِ غیبی کی وہ آواز جو بیابانوں کے کنجوں میں پھنس کر رہ جائے اور سُنی نہ جائے ـــــ کوئی شک نہیں کہ صلوٰۃ اُمّ الدین ہے اور فاتحہ الدین ہے جیسا کہ سورہ الحمد اُمّ القرآن اور فاتحہ القرآن ہے مگر جب تک نہ کھلے تخمِ دین اور تمہیدِ دین ہے اور بس ـــــ صلوٰۃ کو اس سمجھ کے ساتھ نہ ادا کرو کہ وہ نشست و برخاست ہے اور بس۔ صوم ـــ درمیانی عبادت ہے ریاضتی عبادت ہے مگر سکو کی ریاضتی عبادت ہے یعنی وہ جو کہ ریاضت چاہتی ہے مگر وہ ریاضت نہیں جو جذب کے نشان رکھتی ہو وہ ریاضت جو سلوک کی ادا رکھتی ہو۔ سلسلۂ ارتقاء میں صوم، صلوٰۃ سے اوپر کا مقام رکھتی ہے اور تکمیلی عبادت کے لئے دوسرا زینہ ہے جب کہ صلوٰۃ پہلا زینہ ہے۔ صوم مقصدی عبادت ہے جب کہ صلوٰۃ تمہیدی عبادت ہے۔ صلوٰۃ صرف معراج بخشتی ہے اس معنی میں کہ حضور فی اللہ بخشتی ہے اور وصول الی اللہ بخشتی ہے مگر حصول اللہ نہیں بخشتی۔ صوم۔ حصول بخشتا ہے۔ یعنی حصول اللہ بخشتا ہے۔ معراج تمہید ہے۔ حصول مقصد ہے۔ گو ابتدائی مقصد کیونکہ وہ بھی سیر عروجی ہی کا ایک مقام ہے ـــــ اسی لئے صوم ہی کو یہ خاص شرف بخشا گیا کہ خود حضرت الوہیت کو اس کی جزا ٹھہرا گیا جیسا کہ حدیث الصوم لی و انا اُجزیٰ بہ پکار کر کہہ رہی (صوم میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں) ـــــ صلوٰۃ اجمال ہے صوم اس کی تفصیل ہے۔ صلوٰۃ بیج ہے صوم اس بیج کا پودا ہے۔ صلوٰۃ صرف تعلیم ہے۔ صوم اس تعلیم کی تعمیل ہے گو ابتدائی تعمیل۔ صلوٰۃ۔ صرف سکھاتی ہے کہ حکومت کرو اور ربوبیت کرو اور اس نقشے پر کرو۔ صوم حکومت اور ربوبیت کو ابتدائی درجے میں برتواتا ہے کیونکہ وہ حکومت کا لنگر خانہ کھلواتا ہے اور اس سے روزی محروموں کو روزی بٹواتا ہے ـــــ تب صلوٰۃ کے گھمنڈ میں صوم سے بے نیازی مت برتو ورنہ پہلے ہی زینے پر ٹھٹک کر رہ جاؤ گے۔ اوپر چڑھنا نصیب نہ ہوگا ـــــ صلوٰۃ بغیر صوم راہِ ارتقاء و عروج کا پہلا قدم ہے اور بس ـــــ اسی طرح صوم کے گھمنڈ میں صلوٰۃ سے بھی بے پروائی نہ کرو۔ صوم بغیر صلوٰۃ

عزم بغیر حیات ہے اور دوسرا قدم بغیر پہلے قدم کے ہے ——— صوم کو فاقہ سمجھ کر نہ برتو۔ صوم محض فاقہ نہیں ہے افاقہ بھی ہے۔ صوم صائم کو فاقہ کراتا ہے اور محتاج مخلوق کو صائم کے ہاتھوں محتاجی سے افاقہ بخشواتا ہے۔ صوم کو یہ سمجھ کر ادا کرو کہ وہ خلافت و حکومت کا دوگنی اہتمام ہے اور ربوبیت کا پہلا عملی کام ہے۔ کیونکہ صوم اس بات کی عملی تعلیم ہے کہ خود نہ کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اگر اس کی ضرورت آن پڑے۔ پھر صوم جہاد کی تیاری کی مشق ہے جس میں بارہا بھوکا رہنا پڑتا ہے اور بھوکا رہ کر لڑنا بھی پڑتا ہے۔ جہاد خلافت و حکومت ہی کا اہتمام تو ہے۔ پھر صوم وصول باللہ کا اہتمام ہے اور اسی غرض سے اہتمام ہے کہ اس ذریعے خلیفہ اللّٰہیت کا منصب لیں گے اور خلافت الٰہی حکومت ربّانی قائم کریں گے۔

حج ——— صوم کے بھی اوپر کا زینہ ہے ——— حج کی جزا بھی حضرت الوہیت ہی ہو سکتی ہے مگر ولولہ و ولولہ کے رنگ میں ——— حج بھی ریاضتی عبادت ہے اور صوم سے کہیں بڑھ کر ریاضتی ہے۔ صوم سلوکی ریاضت ہے۔ اس میں ہوشمندانہ ریاضت ہے۔ حج صلوٰۃ کی دوسری تشریح ہے۔ حج خلافت و حکومت کا خاصا کھلا ہوا اہتمام اور انتظام ہے اور ربوبیت کا عظیم مرتبہ انصرام ہے۔ صلوٰۃ اور صوم دونوں سے زائد۔ خلافت و حکومت کی بھاگ دوڑ اضطراب و التہاب دور اور چکر۔ سعی اور جہد کتنے کھلے پیمانے پر حج میں ممثّل کی گئی ہے۔ اسی طرح ربوبیت کتنے کھلے اور بڑے پیمانے پر حج میں برتی جاتی ہے۔ گھر سے چل کر گھر پہونچنے تک مختلف صورتوں میں خرچ ہی خرچ اور پرورش ہی پرورش تو ہے ——— حج کو اتنا ہی سمجھ کر نہ ادا کرنا کہ ایک والہانہ اُچھل کود اور مجذوبانہ چیخ پکار ہے۔ ایسا کرنا حج کی گہرائی کی توہین کرنا ہے ——— حج بیشک یہ بھی ہے اور اس کی بھی خاص قیمت ہے۔ منظر بھی اتنا وجد یلا اور یہ سماں بھی اتنا جذبیلا ہے کہ حق ہے اگر آسمان کے ستارے اس کو دیکھ کر ناچنے

لگ جائیں ۔ خود آسمان جھومنے لگ جائیں ۔ انوار الٰہی امڈ امڈ کر بہنے لگ جائیں ۔ پھر بھی حج کی گہرائی اتنی سمائی سے کہیں زیادہ دور ہے ۔ حج کی گہرائی یہ ہے کہ وہ جہادی سرگرمیوں کا بے باکانہ مظاہرہ ہے اور جہادی تیاریوں کا بے پرواہانہ حمار (مشق) ہے ساتھ ہی ساتھ خلافت و حکومت کے شورائی فریضے ، انتظامی نقشے ، ربوبیتی کارخانے کا بھی وسیع المعیار نمونہ ہے ۔

— حج کو یہ اہمیت دے کر ادا کرنا ہو تو ادا کرو ، ورنہ حج کو رسوا مت کرو ۔ حج بیشک تاریخی یادگار بھی ہے ۔ عشقی شعار بھی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اللہ اس کو نہ بھولو کہ خلافتی و حکومتی کاروبار بھی ہے ۔

جہاد — حج سے بھی اوپر کا زینہ ہے اور مرتبے میں بہت اونچا ہے اتنا اونچا کہ گویا ثریا ہے زمین کے مقابلے میں — حج مشق ہی مشق ہے نقل ہی نقل ہے ۔ جہاد اصل ہے اور اصل الاصل — جہاد خلافت و حکومت کے بام مقصود کا آخری زینہ ہے ۔ اسے طے کیا اور قدم یا جنت میں ہے یا خلافت و حکومت کے تخت پر ۔ اسی لئے جہاد کی ناکامی ہی عین کامیابی ہے اور کامیابی انتہائی کامیابی ہے ۔ جہاد ہی ہے جو فوراً ہی بلا انتظار خالی خلیفۃ اللہ بنا دیتا ہے ۔ جہاد سے پہلے صلوٰۃ ہے ۔ جب تک انسان خیالی واستعدادی خلیفۃ اللہ رہتا ہے ۔ جہاد آخری درجہ کی فدائیت و قربانی بھی ہے جو صلوٰۃ سے حج تک کسی کو بھی نصیب نہیں ۔ اسی لئے جہاد کی جگہ وہ قربت الٰہی ہے جس پر جنت بھی فخر کرتی ہے ۔

اک خون کے چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

جہاد صلوٰۃ کی تیسری قسط ہے صوم کی دوسری حج کی پہلی ۔ اس لئے جہاد اپنی بے اندازہ فضیلت کے باوجود صلوٰۃ ، صوم ، حج کا فرزند ہے اور ان پر موقوف و منحصر ہے ۔ اسی لئے جہاد ، صلوٰۃ ، صوم ، حج سے بے نیاز

نہیں بنا سکتا۔ کیسے بے نیاز بنا سکتا ہے انہیں کی پیدا کردہ قابلیتوں کا تو ثمرہ ہے ——— جہاد کی بابت یہ دھوکا نہ کھاؤ کہ وہ صرف جنگ ہی جنگ ہے غدائیت ہی غدائیت ہے اور جنت ہی جنت کی کنجی ہے نہ اتنا ہی سمجھ کر اس خطرناک کھیل کو کھیلو بلکہ یہ سمجھو اور یہ سمجھ کر اس کو پورا کرو کہ وہ خلافت و حکومت کی بھی کنجی ہے اور خلافت و حکومت ہی اس کا راس المال ہے اور یہ سمجھو اور یہ سمجھ کر اس کو ادا کرو کہ وہ ربوبیت کا خزانہ ہے اور ربوبیت اس کا عین المراد ہے ——— فقط جنت کے لئے جہاد کا خواب نہ دیکھو، خلافت و حکومت اور ربانیت و ربوبیت کے لئے بھی دیکھو اور زیادہ تر اسی کے لئے دیکھو۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے۔ جہاد کو خلافت و حکومت اور ربانیت و ربوبیت کا خادم نہیں بنا سکتے۔ صرف اپنی جنت کے لئے زمین پر خون اور آگ کے کھیل کھیل کر اور زمین کو لالہ زار اور خوں بار بنا کے رہنا کیا ضرور ہے؟ خزانۂ قدرت میں جنت کے لئے بہتیری دوسری کنجیاں بھی ہیں۔ پھر خلافت و حکومت بھی تو جنت کا سامان ہے اور ایک ہی جنت کا نہیں جو مجلۂ غیب میں مستور ہے دو دو جنتوں کا ایک غیبی یعنی جنت کا جو آنکھوں سے پنہاں ہے اور مر کر ہی مل سکتی ہے دوسری حضوری نقدی جنت کا جو آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے جو جیتے ہی جی ہاتھ لگ سکتی ہے بغیر اس کے کہ موت کی زحمت کشی کا انتظار کیا جائے۔ پس خلافت و حکومت اور ربانیت و ربوبیت کے لئے بھی جہاد کو سنبھالو جیسا کہ جنت کے لئے۔

خلافت و حکومت برائے ربانیت و ربوبیت

آخری عبادت ہے۔ مقصدی عبادت ہے۔ تکمیلی عبادت ہے اس کے بعد کوئی عبادت نہیں۔ اس کے برابر کوئی عبادت نہیں۔ تمام عبادتیں دنیوی زندگی میں اسی کے لئے ہیں۔ اخروی زندگی میں جنت کے لئے سہی ——— تمام عبادتوں کا

برت اسی کو بناؤ اور انھیں اسی کے لئے برتو ــــ اس یقین کے ساتھ کہ اس کا تصور نہیں اور توسل نہیں تو ساری عبادتیں لنگڑی، لولی اندھی ہیں۔ ساتھ ہی یہ یقین بھی رکھو کہ یہ رأس العبادات تحتانی عبادتوں کے بغیر ہاتھ ہی نہیں آسکتی۔ ممکن ہے، نقلی رنگ میں آجائے۔ اصلی رنگ میں ہرگز نہیں آ سکتی۔ اگر تحتانی عبادتیں نہیں ہیں تو رأس العبادات یعنی خلافت و حکومت نہیں رہ جائے گی بغاوت و خصومت بن جائے گی، ربوبیت کا ذریعہ نہیں رہ جائے گی، ملوکیت کا وسیلہ بن جائے گی ــــ پس جہاں یہ کرو کہ خلافت و حکومت آنے ہی کے لئے طہارت، صلوٰۃ، صوم، حج، جہاد کی عبادتیں برتو اور ان کی زحمت کشیاں گوارا کرو، اور نا گواریوں کو خوش گواریاں بناؤ وہیں یہ بھی کرو کہ خلافت و حکومت کو صحیح رکھنے اور ربّانی بنائے رہنے کے لئے ان تمہیدی عبادتوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو ــــ ان میں ذرا ڈھیل نہ آنے دو ورنہ کارخانہ اُلٹ جائے گا اور کاروبار بگڑ رہے گا۔

ــــ خلافت و حکومت یعنی خلافت الٰہی اور حکومت ربانی اگر عبادت ہے تو اس عبادت کی جزا کیا ہے؟ اس کی جزا حضرت الوہیت ہے۔ ربّیت کی شان میں جس کے برابر کوئی دوسری شان نہیں ــــ صوم کی جزا بھی خود حضرت الوہیت ہے، مگر صمدیت کی شان میں یعنی قدوست کی شان میں ــــ حج کی جزا بھی خود حضرت الوہیت ہے مگر معبودیت کی شان میں ــــ جہاد کی جزا بھی خود حضرت الوہیت ہے مگر قادریت کی شان میں۔

ربوبیت مع الربّیت

خلافت و حکومت مقصد ضرور ہے مگر اس کے علاوہ ایک مقصد المقصد بھی ہے جس کے سامنے مذہبی وسیلہ رہ جاتا ہے ــــ مقصد المقصد کون؟ ربوبیت مع الربّیت خلق کی پرورش۔ حضرت ربوبیت کی مشیّت و مرضی کے مطابق اور حضرت ربوبیت کے احکام ربانی کے موافق ــــ تب خلافت و حکومت تک پہنچکر

اس نشے میں نہ چور ہو جاؤ کہ سفر ختم ہو چکا، منزل مل چکی، اب کمر کھولنا ہے اور عیش اڑانا ہے ——— میرے عزیز! خلافت وحکومت تک پہنچ کر سفر ختم کہاں ہوا۔ سفر تو شروع ہوا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ پہلا سفر ختم ہوا لیکن دوسرا سفر تو شروع ہوا اور یہ سفر پہلے سفر سے کہیں زیادہ سخت ہے اور زندگی تک نہ ختم ہونے والا ہے ——— تب سفر کی کمر کھولو نہیں بلکہ اور مضبوط باندھو اور انتظار میں رہو کہ موت کا ہاتھ اسے کھولے ——— ربوبیت مع الربیت کے مقصد کی اب خدمت شروع کرو۔ ربوبیت مع الربیت اگرچہ عبادت کہہ دی گئی ہے مگر اصل میں روح عبادت ہے، مقصد عبادت ہے نتیجہ عبادت ہے۔ انجام عبادت ہے۔ عبادت اصلی معنی میں خلافت وحکومت پر ختم ہو جاتی ہے۔ ربوبیت اس سے جدا بھی نہیں ہے۔ اس کا ضمیمہ ہے تتمہ ہے، تکملہ ہے، اس کی غرض ہے، غایت ہے، بنیاد ہے، اساس ہے ——— پس ربوبیت عبادت میں داخل بھی ہے اور خارج بھی، جس طرح طہارت، عبادات میں داخل بھی ہے اور خارج بھی ——— ربوبیت مع الربیت ہی کا دوسرا نام ربانیت ہے ——— ربوبیت مع الربیت وہ نیکی اور بھلائی ہے کہ ایک نیکی اور بھلائی بھی اس کے عرشی دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی ——— ربوبیت مع الربیت کا تفصیلی نقشہ بھی خلافت الٰہی وحکومت ربانی کے نقشہ ومقاصد وفرائض کے ضمن میں دیا جاتا ہے۔ اسے سمجھو اور اس کو برتو، جہاں تک برت سکتے ہو۔ رب العالمین تمہارا مددگار ہو ———

خلافت الٰہی وحکومت ربانی کا نقشہ مقاصد وفرائض

(۱) نفسانی حکومتوں کو ربانی حکومتوں سے بدل دینا اور جو بدل نہ سکیں انہیں مٹا دینا ——— ربانی حکومتیں واجب ہیں۔ نفسانی حکومتیں حرام ہیں ——— ربانی حکومتیں خیر وبرکت کا سرچشمہ ہیں۔ نفسانی حکومتیں شر وآفت کا مصدر ہیں ——— ربانی حکومتیں انسان کے واسطے

سعادت ہیں، نفسانی حکومتیں شقاوت ہیں۔

(۳) حکومت کی کثرت کو وحدت سے بدل دینا اور ایک انسانی دنیا کے واسطے ایک ہی حکومت قائم کرنا اور قائم رکھنا۔ ایک نوعی عالمی حکومت بجائے سیکڑوں ہزاروں قومی، ملکی خطّی حکومتوں کے جو فساد کے گھر اور بدامنی کے اڈے ہیں جن میں انسانیت نے آج تک خوں ریزیوں اور سفاکیوں کے سوا کچھ نہ دیکھا، جن سے انسانیت نے بربادیوں، اور تباہیوں کے سوا کچھ نہ پایا۔ اگرچہ انسانیت شیطنت کے اغوا سے فساد انگیزی اور فتنہ خیزی میں خود ڈوب چکی ہے کہ خطرہ ہے کہ یہ سخت دشواریوں سے کمائی ہوئی وحدت کو پھر کثرت میں، یک جہتی کو پھر صد جہتی میں، اتحاد پروری کو پھر تفرقہ اندازی میں، توحید کو پھر شرک میں بدل ڈالنے کی جہالت و سفاہت کرے گی، اور خطرہ کیا ہے یقین ہے پھر بھی نیکی کو قائم کرنا ہی چاہیئے اور ہزار مٹنے پر بھی کرنا چاہیئے۔ اگرچہ ہزار بار نیکی کو بدی سے بدل ڈالا جائے اور مایوس و دل گرفتہ ہو کر قیام نیکی کے کام کو چھوڑ نہیں دینا چاہیئے۔ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ نیکی کے چند لمحے بھی جو سعادت و برکت کے لمحے ہیں غنیمت ہیں اور قیمت رکھتے ہیں۔ پھر یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ انسانیت، اغوائے شیطنت سے لاکھ گردن تک برائیوں میں ڈوبی ہوئی ہو فطرت میں نیک ہے اور اگر اس کی نیک فطرت کو اور اس کی فطرت کی نیکی کو بار بار ابھارا جائے اور سہارا دیا جائے تو اس کی نیک فطرت ضرور ابھرے گی اور دبی نیکی کو ابھارے گی اور ایک وہ وقت آئے گا اور ضرور آئے گا جب کہ اس کو بدی سے پوری بیزاری ہو جائیگی اور نیکی ہی نیکی اس پر چھائی دکھائی دے گی ــــ یہ آج ہو، چاہے ہزار برس بعد ہو، چاہے قیامت کی عین گھڑی میں ہو۔

(۴) حکومتوں کی متفرق صورتوں کو متفرق شریعتوں کو متفرق حقیقتوں کو

ایک ہمہ گیر صورت، ہمہ گیر شریعت، ہمہ گیر حقیقت میں منتقل کر دینا ـــــ یہ صورت حکومت الٰہی کی صورت ہو ـــ یہ وہ شریعت حکومت الٰہی کی شریعت ہو ـــ وہ حقیقت حکومت الٰہی کی حقیقت ہو ـــ وہ صورت وہ شریعت، وہ حقیقت کہاں سے لی جائے گی؟ دین الٰہی سے، اور جامع وکامل دین الٰہی سے، جو تمام اگلے اور پچھلے دینوں کا جامع وکامل ضابطہ ہو۔ ایسی تفسیر و تشریح کے ساتھ جس کی بدولت تمام ادیان الٰہی اور مذاہب حقیقی اس ایک دین الٰہی میں اس طرح سما جائیں جس طرح تمام جاریہ سمندر میں سما جاتے ہیں۔ اور ایک صحیفہ جامعہ کاملہ الٰہیہ سے لی جائے جو تمام صحف الٰہیہ اور کتب حکمیہ کو اپنے اوراق میں اس طرح لپیٹے ہوئے ہو جس طرح کتاب اپنے ورقوں کو لپیٹے ہوتی ہے ـــ اس تفسیر و تشریح کے ساتھ کہ اسکی تہیں کھل جائیں اور اس کی جامعیت اور حاویت آشکارا ہو جائے۔

(۴) قومیتوں اور مملکتوں کی کثرت کو بھی وحدت میں منتقل کر دینا ـــ ایک انسانیت کے لئے ایک ہی قومیت، ایک ہی مملکت ـ قومیت ـ انسانیت مملکت ـ زمین ـ یہ ایک قوم انسانی قوم پکاری جائے ـ یہ ایک مملکت ـ ارضی مملکت کے نام سے یاد کی جائے ـــ قوموں کی تفریق اور مملکتوں کی تکثیر نے بھی فساد ہی فساد شروع کئے ہیں اور تباہی ہی تباہی حوالے کی ہے ـــ فساد کی ان پڑیوں کو عدم کے کنوئیں میں جھونک دو اور ہمیشہ کے لئے ان سے ہاتھ دھو ڈالو۔

(۵) تمام زبانوں، ادبوں، تہذیبوں، مذہبوں، تعلیموں، تبلیغوں، تنظیموں، جمعیتوں، جماعتوں کو ایک زبان، ایک ادب، ایک تہذیب ایک مذہب، ایک تعلیم، ایک تبلیغ، ایک تنظیم، ایک جمعیت، ایک جماعت بنا ڈالنا ـــ ان اختلافوں نے بھی مخالفتوں کے لاتناہی طومار کھڑے کر دئے ہیں اور ان سے تباہیوں کے لاتناہی سلسلے گلے پڑ گئے ہیں ـــ

ان وحدتوں کے نام یہ ہونے چاہئیں ۔ انسانی زبان، انسانی ادب، انسانی تہذیب،
انسانی مذہب، انسانی تعلیم، انسانی تبلیغ، انسانی تنظیم، انسانی جمعیت، انسانی جماعت۔

(۶) تمام بیگانگتوں کو اور بیگانگتوں کی کثرت کو اخوت کی وحدت میں گم کر دینا
اور اس طرح تمام انسانی عداوتوں کو انسانی محبت میں بدل دینا اور انسانی جھگڑوں کو
انسانی مصالحت میں ڈال دینا ــــ بیگانگتوں اور عداوتوں اور جھگڑوں نے
آج تک کچھ نفع پہنچایا؟ یا آئندہ کچھ نفع پہنچانے کی امید دلاتے ہیں؟ ہرگز
نہیں ــــ پھر کیا ان سے نقصانات اور کافی نقصانات نہیں پہونچے؟ یقیناً
پہونچے اور کیا آئندہ نہیں پہونچیں گے؟ ضرور پہنچیں گے۔ پھر ان سے خون
کی طرح لپٹے رہنے اور ان کو جونک کی طرح لپٹائے رہنے کی ضرورت؟
پس چلو ان کو جھاڑ دو جس طرح گرد جھاڑ دی جاتی ہے اور ان کو دھو ڈالو جس
طرح ناپاکی دھو ڈالی جاتی ہے۔

(۷) مصالحت، معاونت، معادلت، مشارکت، مساوات، مواخات کو
عالمگیر بنا دینا ــــ اور اس ذریعے سے انسانیت کی اجتماعی، ذہنی ترقی و تکمیل کی
راہ سے تمام رکاوٹوں کو یکسر مٹا دینا ــــ تاکہ انسانی اجتماعی ترقی تیز اور تیز تر
ہو جائے اور انسانی اجتماعی تکمیل، زود حصول اور زود تر حصول بن جائے ــــ تاکہ
انسانی نظام اس قابل بن جائے کہ ان تیزیوں اور سرعتوں کو ہضم کر سکے۔ پھر اجتماعی
ترقی و تکمیل کے سہارے شخصی ترقیاں اور تکمیلیں بھی تیز تر اور زود تر بن جائیں۔

(۸) غربت و محتاجی، ذلت و کمتری، جہالت و پست ذہنی کا نام و نشان
تک مٹا دینا اور ان کی جگہ فراغت و آسودگی، عزت و برابری، علمیت و بلند
فکری کو ہمہ گیر بنا دینا ــــ سوچو تو یہ بلائیں اور وبائیں اس قابل ہیں کہ
انھیں پالے رکھا جائے اور ان کو بڑھوتری دی جاتی رہے۔ خلقت عامہ
ان بلاؤں اور وباؤں میں پھڑپھڑاتی اور گڑگڑاتی رہیں، جلتی اور جھلستی رہیں۔
تڑپتی اور پھڑکتی رہیں اور تھوڑے سے محفوظ و مسرور لوگ اٹھتے اور بڑھتے

ہوئے یہ ہولناک تماشے اور خوفناک نظارے بے پرواہانہ اور لاابالیانہ بلکہ مخمورانہ اور مستانہ پھٹی آنکھوں دیکھتے رہیں اور جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے رہیں، ساتھ ہی شیطانی قہقہے اور نفسانی چہچہے بلند کرتے رہیں، پھر طعن و تشنیع کی تیر بارانیاں بھی کرتے رہیں اور ملامتوں اور سفاہتوں کی بازشیں بھی داغتے رہیں ــــ اس پر یہ ستم ظریفیاں بھی کرتے رہیں کہ حضرت الوہیت اور ربوبیت کے نام بھی رٹتے رہیں اور وظیفے بھی جپتے رہیں ــــ تف ہے اس انسانیت پر اور تھو ہے اس عبدیت پر ــــــ شرم سے مکروہ حالت پر غور کرو، شرماؤ اور یا تو ڈوب مرو یا اس منحوس حالت کو بدل ڈالو ــــ اس لعنتی غدار کو بھی تہ کر ڈالو بلکہ پاؤں تلے مسل ڈالو کہ حضرت رب العالمین ہی نے یہ چاہا ہے تو ہم کیا کریں؟ غریب حضرت رب العالمین تو اس حالت کے خلاف چیختے چیختے پریشان ہو گیا اور مجبوراً ٹھان لیا کہ تمہیں اس جرم کے عوض اب چین ہی نہ لینے دے گا اور انتقامی کارروائی شروع کر دی جس کی موسلا دھار شرح باڑھیں تم پر برسنا شروع ہو گئیں اور اگر تم بدلے نہیں تو وہ اتنا برسیں گی کہ تمہیں گردن تک نہیں سر تک ڈبو چھوڑیں گی ــــــ عبرت پکڑو عبرت پکڑو، عبرت پکڑو اور اپنے کو اور اس حالت کو بدل ڈالو۔

(۹) مادیت اور روحانیت کی باہمی کشمکش اور کشاکش کو ختم کر دینا، اور دونوں سگی بہنوں کو گلے ملا دینا جو دو سوکنوں کی طرح ناحق جھگڑ رہی ہیں، اور دو ڈائنوں کی طرح خونخوارانہ لڑ رہی ہیں ــــــ مادیت روحانیت کی ٹانگ توڑ رہی ہے اور گلا گھونٹ رہی ہے ــــ روحانیت مادیت کی کمر گھسیٹ رہی ہے اور گردن دبا رہی ہے ــ نعوذ باللہ استغفر اللہ ــــــ اور دونوں کو ربانیت کی جامعیت میں مستقل کر دینا جو دونوں کو دونوں بغلوں میں لئے دبائے بڑھائے چل سکتی ہے اور انسانیت کو دونوں کے بیچ میں اپنے سائے تلے صراط مستقیم پر رواں رکھ سکتی ہے ــــــ تاکہ عملیت درست ہو جائے

اور عملیت تیز ہو جائے۔

(۱۰) ربانیت کی شاہراہ مستقیم کو جس کی نشانیاں اوپر بتائی گئی ہیں عالمگیر شاہراہ بنا دینا۔ پھر اس کے روشن جادۂ مستقیم پر انسانیت کو اس شان سے رواں کر دینا کہ ایک طرف مادیاتی نشوونما اور جسمانی عروج و ارتقا کا ناسوتی کاروبار بھی بلا مزاحمت چلتا رہے اور بے خدشہ و دغدغہ چلتا رہے' دوسری طرف انبیائی ربط وضبط اور روحانیاتی سروطیر کا ملکوتی کارخانہ بھی بلا اندیشہ و تردد جاری رہے۔ اس تسلی وطمانیت کے ساتھ کہ نہ تو ناسوتی کاروبار ملکوتی کارخانے کو ابتر کر رہا ہے نہ ملکوتی کاروبار ناسوتی کاروبار کے رستے میں روڑے بچھا رہا ہے ———— ربانیت کی شاہراہ مستقیم کو تیار کرنے اور عالمگیر بنانے کے واسطے اور اس کے جادۂ مستقیم پر انسانیت کو رواں کرنے کے لئے ایک مؤثر عالم ربانی جماعت قائم کرنا اور اس کو عاملہ کاملہ بنا دینا اس شان سے کہ مؤثر کامل اور فاتح مطلق ربانی طاقت لشکر گراں بنی ہوئی اس کے بازو پر ہو ——— مؤثر کامل اور مسلّم مطلق، ربّانی حکمت و معرفت' تاج درخشاں بنی ہوئی اس کے سر پر ہو۔ ناقابل شکست مجسمۂ صداقت کی خارا شگاف شمشیر اس کے ہاتھ میں ہو۔ کبھی نہ تھکنے والی کہیں نہ رُکنے والی محنت و خدمت کی فلک سیر بجلی اس کے پاؤں میں ہو۔ اور وہ اس ربانی سازوسامان کے ساتھ سرکشی وطغیانی کی نفسانی قوتوں کے شیطانی انبوہوں کو چیرتی پھاڑتی' روندتی کھوندتی' ﷺ لتی' مسلتی' انسانیت کے کاروان رواں کو پیچھے لئے ہوئے' برق وطوفان کی تیزی کے ساتھ ربانی شاہراہ زندگی پر دوڑتی' لپکتی' گرتی' پڑتی اُڑی چلی جارہی ہو ——— اور اس کی اس سائرانہ' طائرانہ' والہانہ' جاذبانہ برق رفتاری کو دیکھ دیکھ کر مشیت الٰہی مع قدرت ربّی' لاہوتی' جبروتی' ملکوتی' ناسوتی دنیاؤں کو سمیٹے ہوئے برکت بار مسکراہٹوں کے ساتھ مستانہ وجد ورقص کر رہی ہو۔

اتمت هذ الکتاب بفضل الرّبّ الوهّاب ۔ و ما توفیق هذ الا بالله العلیّ العظیم ۔ فالحمد لله ربّ العالمین ۰ الرّحمٰن الرّحیم ۰ ملٰک یوم الدین ۰ اللّهم ایاک نعبد و ایّاک نستعین ۰ اهدنا الصّراط المستقیم ۰ صراط الّذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم و لا الضّالّین ۰
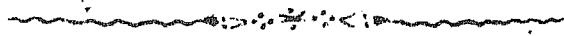
سفرنامہ یورپ و امریکہ

یوں تو دیارِ مغرب کی آئے دن سیاحتیں ہوتی رہتی ہیں، اور اسی لئے سیاحتِ مغرب کی روداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن بایں ہمہ حضرت شیخ الربانیت کی سیاحتِ مغربی ایک خاص "ندرت اور جدت کی حامل ہے۔ اسی سیاحت کے تذکرۂ حالات پر حضرت مذکور خود ایک کتاب سفرنامہ مشاہدات ربانی کے نام سے تین حصوں میں تصنیف کر رہے ہیں۔ موصوف یہ سفرنامہ اپنی گوناگوں اور غیر معمولی مصروفیات کے باوجود دست تیز رفتاری سے لکھ رہے ہیں۔ اگر حالات نے ساتھ دیا اور مشیتِ الٰہی شاملِ حال رہی تو انشاء اللہ یہ سفرنامہ تین چار مہینے میں تیار ہو جائیگا۔ رہا اس کا شائع ہونا وہ حضرت شیخ کے قدردانوں، خصوصاً اربابِ حلقۂ ربانیین کی ہمت اور تنظیم پر موقوف ہے۔

یہ سفرنامہ انشاء اللہ ایک نادر سفرنامہ ہوگا جس کا مطالعہ پڑھنے والوں کو علم و ادب کی ایک نئی دنیا میں پہونچا دے گا، اور ان کے سامنے تجربات و معلومات کا ایک گراں بہا ذخیرہ رکھ دے گا۔ پھر یہ سفرنامہ محض سفرنامہ نہ ہوگا بلکہ ایک ہدایت نامہ بھی ہوگا جو نئی اور پرانی زندگی کے امتزاج و اتحاد کا نیا راستہ بتائے گا، اور یہ دکھائے گا کہ اس نئے دور میں نئے تقاضوں کے تحت ربانی زندگی کس طریقۂ زندگی کا نام ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا سفرنامہ تنوعِ حالات اور ندرتِ تخیلات کے لحاظ سے اس سفرنامہ سے ٹکر لے سکے۔

(زیرِ طبع)

شیخ الربّانیت کی ربّانی تصنیفات

جو فلسفۂ ربانیت اور دین ربّانی کے نشر و احیاء سے تعلق رکھتی ہیں

(۱) ادبیات ربّانی :۔

(الف) رباعیات ربانی ۔ شیخ الربانیت کی [illegible] نادر رباعیوں کا مجموعہ۔ ان رباعیات کا موضوع فلسفۂ ربانیت ہے۔ ان میں فلسفۂ خودشناسی کی (زیر طبع)

(ب) مثنوی ربانی (حصہ اوّل) اس کا موضوع فلسفۂ ربانیت بصورت فلسفۂ روحانیت ہے (زیر طبع)

(۲) دینیات ربّانی :۔

(الف) الکلیات ۔ اس کا موضوع فلسفۂ ربانیت بصورت فلسفہ دین ہے قیمت حصہ اوّل ۔ ۔ ۔ ستے ر

(ب) فلسفۂ ربانیت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ :۔ یہ رسالہ انگریزی میں ہے۔ اور امریکہ میں چھپا ہے۔ اس کو ربانی ایسوسی ایشن نیویارک نے چھاپا ہے۔ اس کے ملنے کا پتہ حسب ذیل ہے۔

مختار احمد ربانی ۔ سکریٹری ربانی ایسوسی ایشن

نمبر ۱۸۶۱ میڈیسن ایونیو نمبر ۳۵ نیویارک

اینڈ اوائی

DATE	NO.	DATE	NO.
14-4-63	1895		